B9ED302EPC

مطالعہ متون اور ان پر اظہارِ خیال

(Reading and Reflecting on Texts)

بیچلر آف ایجوکیشن (بی۔ایڈ۔)

(تیسرا سمسٹر)

Bachelor of Education (B.Ed.)

(Third Semester)

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-انڈیا

Copyright © 2024, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-978965-2-1
Course : Reading and Reflecting on Texts
First Edition : August 2024
Copies : 1000
Price : 130/-

Programme Coordinator (B. Ed.)

Prof. Sayyad Aman Ubed, Professor (Education), CDOE, MANUU

Editorial Board/Editors

Prof. Mushtaq Ahmed I. Patel (Chairperson)
Professor, CDOE, MANUU

Prof. Sayyad Aman Ubed (Member)
Programme Coordinator, B.Ed. (ODL)

Prof. Shaikh Shaheen Altaf (Member)
HOD, Dept. of Edu &Training, MANUU

Dr. Shaikh Wasim (Member Convener)
Associate Professor, CDOE, MANUU
(Content Editor)

Prof. Siddiqui Mohd Mahmood (Member)
Senior Professor, Dept. of Edu &Training, MANUU

Dr. Sameena Basu (Member)
Associate Professor, CDOE, MANUU

(Late) Prof. Najmus Saher (Member)
Professor, CDOE, MANUU

Dr. Abdul Basit Ansari
Assistant Professor, MANUU CTE, Varanasi
(Language Editor)

Production

Prof. Nikhath Jahan, Professor (Urdu), CDOE, MANUU

Mr. P Habibulla, Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan, Assistant Professor (C), CDOE, MANUU

Mohd Abdul Naseer, Section Officer, CDOE, MANUU

Shaik Ismail, UDC, CDOE, MANUU

Faheemuddin, LDC, Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:
Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
Director: dir.dde@manuu.edu.in; *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by: Dr. Mohd Adil, Asst. Prof. (C), CDOE, MANUU

Title Page: Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Prof. (C), CDOE, MANUU

Printed at: Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

فہرست

پیغام	وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	5
پیغام	ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	6
کورس کا تعارف	پروگرام کوآرڈینیٹر (بی۔ایڈ)	7

اکائی نمبر	اکائی کا نام	مصنف	صفحہ نمبر
بلاک I: بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (Engaging with Narrative and Descriptive Accounts)			
1۔	بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (حصہ اول) (Engaging with Narrative and Descriptive Accounts Part-1)	پروفیسر نجم السحر پروفیسر مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو Prof. Najmus Saher Professor Centre for Distance and Online Education, MANUU	9
2۔	بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (حصہ دوم) (Engaging with Narrative and Descriptive Account Part-2)		27
3۔	بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (حصہ سوم) (Engaging with Narrative and Descriptive Accounts Part-3)		39
4۔	بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (حصہ چہارم) (Engaging with Narrative and Descriptive Accounts Part-4)		55
بلاک II: معروف مضامین پر مبنی وضاحتی تحریروں اور صحافتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا (Engaging with Popular Subject-based Expository Writing & Engaging with Journalistic Writing)			
5۔	معروف مضامین پر مبنی وضاحتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا (حصہ اول) (Engaging with Popular Subject Based Expository Writing Part-1)	پروفیسر نجم السحر پروفیسر مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو	68

82	Prof. Najmus Saher Professor Centre for Distance and Online Education, MANUU	معروف مضامین پر مبنی وضاحتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا (حصہ دوم) (Engaging with Popular Subject Based Expository Writing Part-2)	6۔
98		صحافتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا (حصہ اول) (Engaging with Journalistic Writing Part-1)	7۔
114		صحافتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا (حصہ دوم) (Engaging with Journalistic Writing Part-2)	8۔

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ +A حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری/گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات واطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثرانداز ہوگا۔
فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم وتدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلا معاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو/ہندی/انگریزی/عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ سی ڈی اوای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جارہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی اوای، مانو

کورس کا تعارف

"مطالعۂ متون اور ان پر اظہارِ خیال (Reading and Reflecting on Texts) "بی۔ایڈ کے تیسرے سمسٹر کا ایک اہم کورس ہے، جس کا مقصد معلمینِ مستقبل میں مطالعے کی عادت، تنقیدی فہم، تجزیاتی فکر اور مؤثر اظہارِ خیال کی صلاحیتوں کو فروغ دینا ہے۔ تدریس محض معلومات کی ترسیل کا نام نہیں بلکہ مختلف النوع متون کو سمجھنے، ان کے معانی اخذ کرنے، ان کا تنقیدی جائزہ لینے اور ان سے حاصل ہونے والے افکار و تجربات کو تعلیمی عمل سے مربوط کرنے کا نام بھی ہے۔ اسی لیے یہ کورس طلبہ کو مختلف ادبی، وضاحتی اور صحافتی تحریروں کے مطالعے کے ذریعے اس قابل بناتا ہے کہ وہ متن کو صرف پڑھنے تک محدود نہ رہیں بلکہ اس پر غور و فکر کریں، اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کریں اور اپنے خیالات کو مدلل، مؤثر اور تخلیقی انداز میں پیش کر سکیں۔

یہ کتاب مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے فاصلاتی نظامِ تعلیم سے وابستہ طلبہ کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے مرتب کی گئی ہے۔ اس میں مختلف نوعیت کے متون کا انتخاب اس مقصد کے تحت کیا گیا ہے کہ طلبہ مطالعے کے دوران زبان، اسلوب، سیاق و سباق، مصنف کے نقطۂ نظر اور متن میں پوشیدہ سماجی، ثقافتی اور تعلیمی پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ یہ کورس طلبہ میں غور و فکر، تنقیدی مطالعہ، خود احتسابی اور مؤثر ابلاغ کی ایسی صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ایک کامیاب معلم کی پیشہ ورانہ زندگی کے لیے ناگزیر ہیں۔

اس کورس کو دو بلاکس میں منظم کیا گیا ہے، جن میں ہر بلاک چار اکائیوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بلاک "بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا " مختلف بیانیہ اور وضاحتی متون کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس بلاک میں چار حصوں کے ذریعے ایسے متون پیش کیے گئے ہیں جو طلبہ کو مختلف تجربات، واقعات اور انسانی احساسات سے روشناس کراتے ہیں۔ ان تحریروں کے مطالعے کے ذریعے طلبہ نہ صرف زبان اور اسلوب کی باریکیوں سے آگاہ ہوتے ہیں بلکہ متن کے مفہوم، مصنف کے نقطۂ نظر اور اس کے تعلیمی و سماجی مضمرات پر بھی غور کرنا سیکھتے ہیں۔

دوسرا بلاک "معروف مضامین پر مبنی وضاحتی تحریروں اور صحافتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا " کے عنوان سے وضاحتی اور صحافتی متون کے مطالعے پر مرکوز ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر مبنی وضاحتی تحریروں کے ذریعے معلوماتی اور تجزیاتی مطالعے کی مہارتوں کو فروغ دیا گیا ہے، جبکہ صحافتی تحریروں کے مطالعے کے ذریعے معاصر مسائل، حقائق کے تجزیے، تنقیدی شعور اور ذمہ دارانہ اظہارِ رائے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بلاک کا مقصد طلبہ کو مختلف طرزِ تحریر، اسلوبِ بیان اور ابلاغی طریقوں سے متعارف کرانا اور انہیں تدریسی عمل میں متون کے مؤثر استعمال کے قابل بنانا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب اس انداز سے کی گئی ہے کہ مطالعہ محض ایک تعلیمی سرگرمی نہ رہے بلکہ غور و فکر، مکالمے اور خود احتسابی کا ذریعہ بن جائے۔ منتخب متون اور ان سے متعلق سرگرمیاں طلبہ کو یہ موقع فراہم کرتی ہیں کہ وہ مختلف زاویۂ ہائے نظر کو سمجھیں، اپنی رائے تشکیل دیں اور اسے مدلل انداز میں پیش کرنے کی مشق کریں۔ امید ہے کہ یہ کتاب فاصلاتی نظامِ تعلیم سے وابستہ بی۔ایڈ طلبہ میں بامقصد مطالعے، تنقیدی تفکر، حساس مشاہدے اور مؤثر اظہارِ خیال کی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہو گی۔

پروفیسر سید امان عبید
پروگرام کوآرڈینیٹر

اکائی 1۔ بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (حصہ اول)

(Engaging with Narrative and Descriptive Accounts Part-1)*

اکائی کے اجزاء

1.0 تمہید (Introduction)

1.1 مقاصد (Objectives)

1.2 متن (1) ذوقِ چائے نوشی (The Taste for Tea Drinking)

1.3 متن (2) مولانا وحیدالدین سلیم (Maulana Waheeduddin Saleem)

1.4 متن (3) مردہ بہ دستِ زندہ (The Dead at the Hands of the Living)

1.5 متن (4) A Service of Love

1.6 متن (5) Dancing in the Rain

1.7 خلاصہ (Summary)

1.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1.9 فرہنگ (Glossary)

1.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

1.0 تمہید (Introduction)

جیسا کہ کورس کے تعارف میں بتایا جاچکا ہے، اس اکائی میں پانچ مختلف متون پیش کیے جارہے ہیں جو بیانیہ اور وضاحتی نوعیت کے ہیں۔ ان میں انگریزی سے دو متون لیے گئے ہیں جو نویں تا بارھویں جماعت کے نصابی کتب سے منتخب کیے گئے ہیں اور بقیہ تین متون اردو زبان کی نصابی کتب برائے گیارھویں، بارھویں اور ڈگری سطح سے منتخب کیے گئے ہیں۔ آپ ان کا غور سے مطالعہ کیجیے۔ مطالعے کے دوران ان متون کی لسانی خصوصیات، اسلوبیاتی اور جمالیاتی پہلوؤں پر بھی توجہ مرکوز کیجیے۔ مطالعے کے بعد آپ ان متون کے آخر میں دی گئی مختلف سرگرمیوں پر عمل کریں۔

* Prof. Najmus Saher, Professor, Centre for Distance and Online Education, MANUU

1.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ ؛

- کسی بھی بیانیہ اور وضاحتی متن کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔
- کسی بھی متن کی تلخیص پیش کر سکیں۔
- کسی بھی بیانیہ متن کو مکالمہ میں تبدیل کر سکیں۔
- اپنی زندگی کے واقعات کو دوسروں کے آگے بیان کر سکیں۔
- کسی بھی واقعہ کو سن کر یا پڑھ کر اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں۔

1.2 متن(1)ذوق چائے نوشی(The Taste for Tea Drinking)

ذیل میں دیا گیا متن مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ''غبار خاطر'' سے لیا گیا ہے۔ ''غبار خاطر'' مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے احمد نگر جیل میں قید کے دوران اپنے دوست حبیب الرحمن خاں شیر وانی کو لکھے تھے۔ یہ خطوط ''انشاپردازی'' کے بہترین نمونے ہیں اور انہیں ادب کے شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ ''غبار خاطر'' سے منتخب ایک خط کا متن ''ذوق چائے نوشی'' کے زیر عنوان پیش کیا جارہا ہے۔

''آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔ یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُر کیف وقت ہوتا ہے لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اُٹھے اور قرینے سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس وقت بادَہ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں، پھر جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولّیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سر و سامان کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جائوں گا اور کچھ نہ پوچھئے کے بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جائوں گا؟ کسی بادہ گُسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہہ خانوں کے عرق کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجئے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشانِ کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لیے رک جائوں گا۔ اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دوں گا۔ پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھائوں گا، اور دنیا کو اور اس کے

سارے کارخانہ سود وزیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں، اُسی عالم میں ہوں اور نہیں جانتا کہ ۹ر اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہُوا اور اب کیا ہو رہا ہے۔

میرا دوسرا پر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے، یا زیادہ صحتِ تعیّن کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں، تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں۔ پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں، اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گُم ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سُورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا، اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں۔ لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں ، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی، یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہُوا کہ مر جایئے۔ اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہُوا کہ زندہ رہیئے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پُرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے ''سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے؟'' پھر جواب دیا ہے۔ ''جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے'' اس سے ہم چینی فلسفہ زندگی کا زاویہ نگاہ معلوم کر سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے:

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے، تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی، کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیئے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیئے کہ کہ اپنے چہروں کو غمگیں نہ بنائیں۔ زمانہ حال کے ایک فرانسیسی اہل قلم آندرے ژید (Andre Gide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے۔ ''خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے یا یُوں کہیئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہُوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں''۔

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے اگر ایک چہرے پر بھی غبار آ جائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموعہ کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی۔ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی، اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکھٹّے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check Your Progress)

1۔ درج ذیل الفاظ کی وضاحت کیجیے۔

(الف) بادہ کہن (ب) گوشہ ہائے خاطر (ج) دست شوق (د) سرمستیاں اور خود فراموشیاں

2۔ ''ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔'' اس جملے کی مصنف کس طرح وضاحت کرتا ہے؟

1.3 متن(2) مولانا وحید الدین سلیم(Maulana Waheeduddin Saleem)

درج ذیل اقتباس بابائے اردو مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا خاکہ ہے جو ان کی مرتب کردہ کتاب ''چند ہم عصر'' سے لیا گیا ہے۔ اس خاکہ کو بغور پڑھیے اور پھر آخر میں دی گئی سرگرمیوں پر عمل کیجیے۔

مولانا سلیمؔ کے انتقال سے اردو ادب کی صف میں ایک جگہ خالی ہو گئی ہے جس کا پر کرنا آسان نہیں۔ جامعہ عثمانیہ ہی کو ان کا جانشین ملنا مشکل نہیں بلکہ اب ان جیسا ادیب سارے ملک میں نظر نہیں آتا۔ وہ ایک جامع حیثیت شخص تھے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ اردو زبان پر ان کی وسیع نظر تھی۔ خاص کر نئے الفاظ بنانے میں انہیں بڑا ملکہ تھا، ان کی کتاب ''وضع اصطلاحاتِ علمیہ'' ایک حد تک ان کی وسعت نظری اور تبحر کی شاہد ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے نثار تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ شاعری ان کی زورِ طبیعت کا نتیجہ تھی، بعینہ جیسی مولوی نذیر احمد مرحوم کی شاعری، لیکن ''سلیم'' مرحوم ان سے سبقت لے گئے تھے۔ ان کے قلم اور آواز میں بڑا زور تھا۔ ان کے چہرے سے ان کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب باتیں مولوی نذیر احمد سے ملتی جلتی تھیں۔

مرحوم نے عمر بھر یا تو طالب علمی کی یا علم و ادب کی خدمت کی۔ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے علاوہ وہ اعلیٰ درجہ کے اخبار نویس بھی تھے۔ ''مسلم گزٹ'' کے پرچے جن صاحبوں نے غور سے پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ایسے زبردست مضامین معاملات وقت پر کسی دوسرے اخبار میں نہیں نکلے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کو جب انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کی کایا پلٹ دی۔ یا تو وہ ایک مردہ اخبار تھا دفعتاً زندہ ہو گیا۔ ان کا رسالہ ''معارف'' اردو کے ان چند رسالوں میں ہے جنہوں نے ملک میں علمی ذوق پیدا کر کے زبان کی حقیقی خدمت کی ہے۔ وہ کسی رنگ میں ہوں، تھے وہ ادیب ہی سیاست کا انہیں کوئی ذوق نہ تھا البتہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔

مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا، جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے، کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے۔ ان کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ہونے کے سیاست کا ذوق نہ تھا اسی طرح باوجود زبردست عالم و فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یہ ذوقی چیز ہے اسے علم و فضل سے کوئی واسطہ نہیں۔

جس طرح انہیں طالب علمی میں مولانا فیض الحسن جیسے بے مثل ادیب، استاد ملے اسی طرح اس کے بعد سرسید اور مولانا حالی جیسے اعلیٰ خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے۔ ان بزرگوں نے ان کے خیالات اور ادب پر بہت اثر ڈالا۔ مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے، مصلحت وقت

اور زمانہ شناسی ان کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی بد نصیبی سے انہوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیے اور کچھ صحبت اور تجربہ، ان میں سے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

ان کے دوست بہت ہی کم تھے۔ شاید دو چار ہی ہوں گے مگر جن کے دوست تھے دل سے تھے لیکن ساتھ ہی بہت مرنج و مرنجان تھے کسی کو حتی المقدور ناراض نہیں ہونے دیتے تھے۔ خود خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنا چاہتے تھے۔ بہت بے تکلف تھے اور خوب باتیں کرتے تھے اور خوب ہنستے اور ہنساتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کو مولانا سے بہتر پروفیسر نہیں مل سکتا تھا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہے وہاں اردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جو اس کی شان اور ضرورت کے مطابق ہو۔ انہوں نے اس جامعہ کے طلبا میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا ہے وہ انہیں کا کام تھا اور یہ بہت بڑا احسان ہے۔ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا راستہ خود نکال لیتا ہے۔

مرحوم کی طالب علمی کا زمانہ بہت عسرت میں گزرا اور آخری زمانہ جو فارغ البالی کا تھا وہ بھی افسوس ہے کہ عسرت ہی میں بسر ہوا۔ انہیں اپنی فارغ البالی سے کچھ لینا نہ تھا۔ گویا ان کی عمر زیادہ نہ تھی شاید اڑسٹھ کے لگ بھگ، لیکن ان کے قویٰ ایسے اچھے تھے کہ بہت دنوں اور جی سکتے تھے لیکن انہوں نے کبھی صحت و صفائی کا خیال نہ رکھا اور نہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام کیا۔ وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے یہی ان کی بیماری اور بالآخر ان کی موت کا باعث ہوا۔

انجمن ترقی اردو اور خاص کر رسالہ ''اردو'' سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ان کے بعض بہترین مضامین ''اردو'' میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا شرر مرحوم کے انتقال پر جب انجمن نے مرحوم کے نام سے ''اردو'' کے بہترین مضامین کے لیے مستقل طور پر سالانہ تین انعامات کی تجویز کی تو سب سے پہلا انعام جو دو سو روپیہ کا تھا مولانا نے خود ہر سال دینا منظور فرمایا۔ وہ صرف ایک سال دینے پائے تھے کہ دوسرے سال خود اس دنیا سے منھ موڑ کر چلے گئے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ میرے مہربان اور شفیق دوست تھے اور مجھے ان کی موت کا بے حد رنج ہے۔ میں ان کی موت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ ان کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا۔ ہر علمی اور ادبی کام میں ہم ان کا نام سب سے پہلے شریک کرتے تھے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہو گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جیسی طبیعت، ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں ان کی تحریر میں بڑی قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ بات کی تہہ کو خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو استاد تھے۔ جدید تعلیم نہیں پائی تھی مگر مغربی تعلیم کی جو منشا ہے اس سے ایسے واقف تھے کہ جب کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہوں گے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مگر جب انگریزی سے اردو میں اصطلاحات یا الفاظ ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو انگریزی داں بھی ان کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے، وہ الفاظ اور ان کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں۔ جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آرہے ہیں۔

ہمیں ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں وقف کر دی ہو۔ اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم بننا بہت دشوار ہے۔

انہوں نے محض اپنی محنت اور قابلیت سے یہ درجہ پایا۔ایک غریب لڑکا جس کے پاس پڑھنے کو کتابیں اور بھر پیٹ کھانے کو روٹی نہ تھی۔وہ اپنی ہمت اور شوق اور اپنے علم و فضل کے زور سے ایسا ہوا کہ آج اس کی موت پر ایک بڑے طبقے کو حقیقی رنج اور افسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو علم و ادب کا ایک ستون گر گیا۔ان کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انہیں دونوں کا خانہ زاد ہے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check Your Progress)
1۔ اردو کی اصطلاحات سازی میں وحید الدین سلیم کی کیا خدمات ہیں؟
2۔ اس خاکے میں مولانا کی کن فطری خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے؟

1.4 متن(3)مردہ بہ دست زندہ(The Dead at the Hands of the Living)

اردو طنز و ظرافت کی نثر میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔چنانچہ ان کا ایک مضمون ''مردہ بہ دست زندہ'' سے ذیل میں اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔اسے پڑھیے اور پڑھتے وقت اس میں پائے جانے والے طنز و ظرافت پر غور کیجیے۔

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہے۔پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔جنازہ کے ساتھ جانا اب سب رسمًا رہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا، مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔آیئے میرے ساتھ آیئے کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجیے۔ سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں۔ امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ ''کیا مر گئے؟ بھی ہمارے تو بڑے دوست تھے''۔ اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجیے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔اب دنیا بھر کے قصے چھڑے ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھینچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کچھ ادھر ہو گئے کچھ اُدھر۔آگے آگے جنازہ ہے،اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی۔اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انہوں نے چال آہستہ کر دی جنہیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اُجرت پر بلایا گیا تھا۔اس کے پیچھے وہ لوگ

رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں یا ''شرماشرمی پیدل'' ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔آخر میں وہ طبقہ جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹاتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدیدار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں۔ اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں۔ اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کر کپڑے بدل کر خاص اسی جنازہ کے لیے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں۔ یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انہوں نے وقت گزار دیا۔ ہاں اس بات کا احترام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازہ کی طرف بڑھے۔ ادھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔ یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کو سنئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے، مرنے والے کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کے تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لیے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)

1۔ اوپر کے دیے گئے متن کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

2۔ اوپر دیے گئے متن میں میت کی تعریف کا حال کس طرح پیش کیا گیا ہے؟

_____

_____

1.5 متن A Service of love (4)

When one loves one's Art no service seems too hard.

Joe Larrabee came from the Middle West with a genius for painting. As a child of six, he drew a picture of the town pump with an important citizen passing it in a hurry. This effort was framed and hung in the drug store window. At twenty he left for New York with a flowing necktie and

small capital.

Delia Caruthers came from the South. She was so promising a singer that her relatives collected a small amount for her to go to New York and learn music.

Joe and Delia met in a studio where a number of art and music students had come together to discuss their art. Joe and Delia fell in love and in a short time were married - for, when one loves one's Art no service seems too hard.

Mr. and Mrs. Larrabee began to live in a flat. It was a lonely place. But they were happy - for they had their Art, and they had each other. And my advice to the rich young man would be: sell all you have, and give it to the poor - for the happiness of living in a flat with your Art and your Delia.

Joe was painting in the class of the great Magister - you know his fame as painter. His fees are high; his lessons are light. Delia was studying under Rosenstock - you know his fame as musician.

They were mighty happy as long as their money lasted. Their aims were very clear. Joe would learn very soon to paint pictures that old gentlemen with side-whiskers and thick purses would fight with one another in his studio for buying. Delia was going to master the piano and fill concert halls all over the country with people who would pay twice as usual rates to hear her play.

But the best, in my opinion, was the home life in the little flat - the warm chats after the day's study; the pleasant dinners and fresh, light breakfasts; the exchange of hopes; the help and love they gave each other.

But after a while Art became weak. Everything going out and nothing coming in, as people say. There was no money to pay Mr. Magister and Mr.

Rosenstock their fees. When one loves one's Art no service seems too hard. So, Delia said she must give music lessons to buy their food.

For two or three days she went out looking for pupils. One evening she came home in high spirits.

'Joe, dear, she said, happily, I have a pupil. And, oh, the loveliest pupil! General - General A. B. Pinkney's daughter on Seventy- first Street. Such a splendid house, Joe, you should see it. Oh, Joe, I never saw anything like it before.

"My pupil is his daughter Clementina. I dearly love her already. She's a delicate thing - dresses always in white; and the sweetest, simplest manners! Only eighteen years old. I have to give three lessons a week; and, just think, Joe! Five dollars a lesson. I don't mind it a bit; for when I get two or three more pupils, I can continue my lessons with Mr. Rosenstock. Now, don't look so unhappy, dear, and let's have a nice supper".

"That's all right for you, Dele," said Joe, opening a tin of peas, " but how about me? Do you think I'm going to let you work for wages while I enjoy myself painting? No. I can sell papers or break stones and bring in a dollar or two".

Delia came and hung about his neck.

"Joe, dear, you are silly. You must keep on at your studies. I hadn't left my music and gone to work at something else. While I teach, I learn. I am always with my music. And we can live as happily as rajah's on fifteen dollars a week. You mustn't think of leaving Mr. Magister'.

'All right, said Joe, reaching for the vegetable dish. 'But I hate your giving lessons. It isn't Art. But you're a dear to do it'.

'When one loves one's Art, no service seems too hard, said Delia.

'Magister praised the sky in that drawing made in the park, said Joe. 'And Tinkle gave me permission to hang two of them in his window. I may sell one if the right kind of a rich art-collector sees them'.

'I am sure you will, said Delia, sweetly. 'And now let's be thankful for General Pinkney and this chicken roast'.

During all of the next week the Larrabees had an early breakfast. Joe was very much interested in some morning-effect sketches he was doing in Central Park, and Delia packed him off, breakfasted, hugged, praised, and kissed at 7 o'clock. Art is a charming mistress. It was most often 7 o'clock when he returned in the evening.

At the end of the week Delia, sweetly proud but tired, threw three five-dollar bills on the 8x10 (feet) sitting room.

'Sometimes, she said, a little wearily, 'Clementina tries my patience. I' m afraid she doesn't practise enough, and I have to tell her the same thing so often. And then she always dresses entirely in white, and that does get boring. But Gen. Pinkney is the dearest old man'!

I wish you could know him, Joe. He comes in sometimes when I am with Clementina at the piano- he is a widower, you know - and stands there pulling his white beard. 'And how are the lessons getting on?', he always asks.

'I wish you could see the drawing-room, Joe, and rugs! And Clementina has such a funny little cough. I hope she is stronger than she looks. Oh, I really am getting very fond of her; she is so gentle and noble. Gen. Pinkney's brother was once Minister to Bolivia'.

And then Joe, with pride, drew forth a ten, a five, a two and a one - all new dollar notes - and laid them beside Delia's earnings.

'Sold that water colour of the tower to a man from Peoria,' he announced joyfully.

'Don't joke with me,' said Delia, 'not from Peoria'!

'All the way. I wish you could see him, Dele. Fat man with a woollen muffler and a bald head. He saw the sketch in Tinkle's window and thought it was a windmill at first. He bought it anyhow. He ordered another - an oil sketch of the Lackawanna goods yard to take back with him. Music lessons! Oh, I guess Art is still in it.

'I' m so glad you've kept on,' said Delia, heartily. 'You're certain to succeed, dear. Thirty-three dollars! We never had so much to spend before. We'll have oysters tonight'.

'And with champignons,' said Joe.

On the next Saturday evening Joe reached home first. He spread his eighteen dollars on the dining table and washed what seemed to be a great deal of dark paint from his hands.

Half an hour later Delia arrived, her right hand tied up in a shapeless bundle of wraps and bandages.

'What happened?' asked Joe after the usual greetings. Delia laughed, but not very joyously.

'Clementina,' she explained, 'said we must have a Welsh rabbit after her lesson. She is such a strange girl. Welsh rabbits at five in the afternoon! The General was there. You should have seen him run for thd dishes Joe, as if there wasn't a servant in the house. I know Clementina isn't in good health; she is so nervous. In serving the rabbit she spilled a great lot of it, boiling hot, over my hand and wrist. It hurt awfully, Joe. And the dear girl was so sorry! But Gen. Pinkney! - Joe, that old man nearly went mad. He rushed

downstairs and sent somebody out to a drugstore for some oil and things to bind it up with. It doesn't hurt so much now".

"What's this?" Asked Joe, taking the hand tenderly and pulling at some white threads beneath the bandages.

'It's something soft,'said Delia, "that had oil on it. Oh, Joe, did you sell another sketch?' She had seen the money on the table.

"Did I? Said Joe; 'just ask the man from Peoria. He got his goods yard today, and he isn't sure but he thinks he wants another view of the park and a view on the Hudson River, what time this afternoon did you burn your hand, dele'?

'Five o' clock, I think,'said Dele sadly. "The iron- I mean the rabbit came off the fire about that time. You ought to have seen Gen. Pinkney, Joe, when'.....

'Sit down here a moment, Dele,'said Joe. He drew her to the sofa, sat beside her and put his arm across her shoulders.

'What have you been doing for the last two weeks, Dele?' he asked.

She looked at his face for a moment or two with an eye full of love, and murmured a word or two about Gen. Pinkney; but at length down went her head and out came the truth and tears.

'I couldn't get any pupils,'she confessed. 'And I couldn'think of your giving up your lessons; and I got a place ironing shits in that big Twenty fourth Street Laundry. And I think I did very well toinvent both General Pinkney and Clementina, don't you, Joe? And when a girl in the laundry set down a hot iron on my hand this afternoon, I was inventing that story about the Welsh rabbit all the way home. You're not angry, are you, Joe? And if I hadn't got the work, you mightn't have sold your paintings to that man from

Peoria".

He wasn't from Peoria,' said Joe, slowly.

'Well, it doesn't matter where he was from. How clever you are, Joe- and- kiss me, Joe- and what made you ever suspect that I wasn't giving music lessons to Clementina'?

'I didn't,' said Joe, 'until tonight. I sent up this cotton waste and oil from the engine- room this afternoon for a girl upstairs who had her hand burned with an iron. I've been working the engine in that laundry for the last two weeks,'

'And then you didn't".....

'My buyer from Peoria,' said Joe, 'and Gen. Pinkney are both creations of the same art - but you wouldn't call it either painting or music".

And then they both laughed, and Joe began:

'When one loves one's Art no service seems'-

But Delia stopped him with her hand on his lips. 'No,' she said - 'just "When one loves." (Slightly simplified version).

(Check Your Progress)

1. Describe the events that led to the marriage of Joe and Delia?
2. What do you understand by the term "when One loves one's Art, no service seems too hard.

_____

_____

1.6 متن Dancing in the Rain (5)

1۔ One often hears of the high prevalence of child labour in our country. Of the many reports I have read, perhaps the most disturbing was a report on

the condition of children employed by zari factories in Delhi, Mumbai and other parts of India. It grieves me to imagine children exposed to such inhumanity.

2. Robbing children of their childhood is a criminal act, and our society must weed this malaise out from the root. But where does the root lie? Before you attempt an answer, let me give you an anecdote from the other end of the social spectrum.

3. A colleague in Wipro has a child studying in standard nine of a reputed school in Bangalore. This child wakes up at 5 a.m. and studies for an hour before going to school. She returns from school at 4 p.m. and rushes for her IIT entrance exam coaching class. At 6 p.m., she has tuitions for 2 hours. Post dinner, she spends an hour or more on homework. I asked her when she gets time to play. She replied that she does not play. She gets half - hour of free time each day, which she spends watching her favourite serial on television. She also added that board exams and entrance exams are very important, and that you only get one chance.

4. Is the condition of this child different from that of the child in the zari factory?

5. When I look at children, I wonder whether they have time to play with friends, to meet interesting people, to explore the world, and to follow their curiosity. When the first monsoon showers begin, I would think that the streets would be full of children rushing headlong into the rain, dancing and playing. However, I think today, the rains fall on empty streets.

6. This, my friends, is the new Indian reality in our villages, in our slums, and in our metropolitan high-rises. Whatever the reasons - poverty,

societal aspiration, apathetic individuals and organizations, or just the burden of circumstances - the reality is that our children are straitjacketed.

7- The final indicator of a country's independence is the way its children live. Are children free from the malaise of poverty and hunger? Are they free from the burden of parental aspiration? Are they free from norms of social conditioning? Are we enduring the curiosity of our children continue to burn and is not stamped out? Are they free to explore the world, to realize their unique potential, and thereby, help discover the true potential of the society itself?

8- Gandhiji said that the greatest lessons in life are learnt from children, not from learned men. A child will fearlessly try before giving up. As adults, fearing failure, we give up even before we try. A child is inherently curious about the world, about relationships, about wanting to understand how things work. As adults, our blinkered and conditioned self prevents us from truly exploring without prejudice. For a child, what she does is meaningful in its own right. As an adult, we usually link every action to an external reward of money or recognition.

9- I did not learn how to be a father from manuals. Whatever little I learnt about being a parent, I learnt by observing my children and letting them teach me. Similarly, I think our teachers could grow enormously by learning from their students.

10- We will then refrain from pushing our knowledge down their young minds, and begin the democratic process of being joint learners as we discover and understand our world. I believe a powerful force for empowerment is to have motivated teachers who are learners first, teachers second. Only then will we stop trying to mould children into our

"adult" likeness. Only then will we let them blossom.

11۔If India has to develop economically, socially, intellectually, and culturally, we must empower those most vulnerable to social diktat: our children. Let us resolve to give our children the freedom of childhood; let us change our schools from being textbook prisons to laboratories of exploration; let us change homes from being tuition centres to playgrounds of art and sport.

12۔India will be radiant when our children are free to dance in the rain.

(Check Your Progress)

1. Express your opinion regarding child labour.

2. "Great Lessons in life are learnt from children, not from men." Elaborate in your own words.

_____

_____

1.7 خلاصہ (Summary)

یہ اکائی ''بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا طلبہ کو مختلف بیانیہ اور وضاحتی متون کے ذریعے زبان، اسلوب اور فکر کی گہرائیوں سے روشناس کراتی ہے۔ اس میں پانچ منتخب نصوص شامل ہیں، جن میں تین اردو اور دو انگریزی متون ہیں۔ پہلا متن ''ذوقِ چائے نوشی ''مولانا ابوالکلام آزاد کے انشائیہ اسلوب کا نمائندہ ہے جو ان کی انفرادی زندگی، چائے نوشی کے ذوق اور خوش رہنے کے فلسفے کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا متن ''مولانا وحیدالدین سلیم ''ایک خاکہ ہے جو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا، جس میں مولانا سلیم کی علمی، ادبی اور انسانی خوبیوں کو سراہا گیا ہے۔

تیسرا متن ''مردہ بہ دست زندہ ''مرزا فرحت اللہ بیگ کا طنزیہ مضمون ہے جو معاشرتی ریاکاری اور انسانی بے حسی کو ظرافت کے پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ چوتھا متن ''A Service of Love''او۔ ہنری کی ایک دلچسپ کہانی ہے جو قربانی، محبت، اور فن سے وابستگی کے جذبات کو اجاگر کرتی ہے۔ پانچواں متن ''Dancing in the Rain''حوصلہ، امید اور زندگی کے مثبت رویے کا پیغام دیتا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے طلبہ نہ صرف بیانیہ اور وضاحتی طرزِ تحریر کی خصوصیات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ ان میں زبان کے فہم، خلاصہ نویسی، مکالمہ سازی، اور تخلیقی اظہار کی صلاحیت بھی پروان چڑھتی ہے۔

1.8 اکتسابی نتائج(Learning Outcomes)

اس اکائی میں ہم نے سیکھا کہ :

- بیانیہ اور وضاحتی متون کے بنیادی مفہوم اور خصوصیات کو پہچانا جاسکتا ہے۔
- مختلف اسالیبِ بیان کے ذریعے معنی اور جذبات کے اظہار کو سمجھا جاسکتا ہے۔
- کسی متن کا خلاصہ اور اس کی مرکزی خیال کو مؤثر انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے۔
- بیانیہ متن کو مکالماتی یا تخلیقی انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔
- مطالعے، سننے اور مشاہدے کے بعد اپنے تجربات کو تحریری صورت میں ڈھالا جاسکتا ہے۔
- اردو اور انگریزی متون کے درمیان اسلوبی فرق کو سمجھ کر زبان کے استعمال میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔
- بیانیہ ادب کے مطالعے سے اخلاقی، انسانی اور سماجی اقدار کو گہرائی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

1.9 فرہنگ(Glossary)

ذوق	:	شوق، شدت کی چاہت
پُر کیف	:	پر لطیف، بامزا
احتیاج	:	حاجت، ضرورت
Circumstances	:	حالات، حقیقت حال
Inherently	:	توارثی طور پر

1.10 نمونہ امتحانی سوالات(Model Examination Questions)

معروضی جوابات کے حامل سوالات(Objective Type Questions)

1۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف نہیں ہے۔

(1)غبار خاطر (2)تذکرہ (3)ترجمان القرآن (4)شکوہ

2۔ متن ''ذوق چائے نوشی''، مولانا ابوالکلام آزاد کی کس تصنیف سے لیا گیا ہے؟

(1)غبار خاطر (2)تذکرہ (3)ترجمان القرآن (4)ان میں سے کوئی نہیں

3۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصنیف / تصانیف ہیں۔

(1)دہلی کی آخری شمع (2)انشاء (3)دیوان یقین (4) سبھی

مختصر جوابات کے حامل سوالات(Short Answer Type Questions)

1۔ انگریزی زبان کی ہائی اسکول کی درسی کتاب سے کوئی ایک اکائی منتخب کیجیے اور اس کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

2۔ ذوق چائے نوشی متن کی تلخیص اپنے الفاظ میں کیجیے۔

3۔ Describe the events that led to the marriage of Joe and Delia?

طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1۔ ہائی اسکول کی اردو کی کسی بھی درسی کتاب سے کوئی ایک متن منتخب کیجیے اور اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

2۔ گیارھویں اور بارھویں جماعت کی اردو زبان کی کسی بھی درسی کتاب سے کوئی ایک اکائی منتخب کیجیے اور اس پر اپنے خیال کا زبانی اور تحریری دونوں طرح سے اظہار کیجیے۔

3۔ مولانا وحیدالدین سلیم کے علمی کارناموں کا بیان اس خاکے کے حوالے سے کیجیے۔

1.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد(Suggested Reading Materials)

1۔ Azeem H Premji, "Dancing in the Rain", Interactive English, for Intermediate II Year, Published by Telugu Academy, Hyderabad

2۔ O Henry, "A Service of Love" Interactive English, for Intermediate First Year, Published by Telugu Academy, Hyd.

3۔ ابوالکلام آزاد ''ذوق چائے نوشی'' مطالعہ ادب (حصہ دوم)، مرتبہ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، ناشر تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی، حیدرآباد

4۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ''مردہ بہ دست زندہ'' مطالعہ ادب (حصہ دوم)، مرتبہ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، ناشر تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی، حیدرآباد

5۔ مولوی عبدالحق ''مولانا وحیدالدین سلیم''، گلزار ادب (حصہ دوم)، مرتبہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن، ناشر تلگو اکیڈمی، حیدرآباد

اکائی 2۔ بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (حصہ دوم)

(Engaging with Narrative and Descriptive Account Part-2)*

اکائی کے اجزاء

2.0 تمہید (Introduction)

2.1 مقاصد (Objectives)

2.2 متن (1) اے انسان! وقت کی قیمت پہچان (O Human! Realize the Value of Time)

2.3 متن (2) مسلمانوں کا دورِ قیادت (The Era of Muslim Leadership)

2.4 خلاصہ (Summary)

2.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

2.6 فرہنگ (Glossary)

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

2.0 تمہید (Introduction)

جیسا کہ اکائی 1 میں آپنے دیکھا کہ پانچ متون دیئے گئے تھے اور ان سے متعلق سرگرمیاں دی گئی تھیں۔ اس اکائی میں دو متون دیئے گئے ہیں جو وضاحتی اور معلوماتی نوعیت کے ہیں۔ پہلا متن ''حیدرآبادی دستر خوان'' طیبہ بیگم کی کتاب ''میرا حیدرآباد'' سے لیا گیا ہے۔ دوسرا متن ''مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم'' سے لیا گیا مضمون ہے جس کا عنوان ہے ''چار مینار۔ دوراہے پر'' آپ ان کا غور سے مطالعہ کیجیے۔ مطالعہ کے دوران ان متون کی لسانی، اسلوبیائی اور جمالیاتی پہلوؤں پر توجہ مرکوز کیجیے۔ مطالعہ کے بعد آپ ان متون کے آخر میں دی گئی مختلف سرگرمیوں پر عمل کریں۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- متن کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔

* Prof. Najmus Saher, Professor, Centre for Distance and Online Education, MANUU

- اس قسم کے دوسرے متون کو زبانی اور تحریری دونوں طرح بیان کر سکیں۔
- متون کے لسانی، اسلوبیائی اور جمالیاتی پہلوؤں کی نشاندہی کر سکیں۔

2.2 متن(۱)حیدرآبادی دستر خوان(O Human! Realize the Value of Time)

دستر خوان حیدرآباد کی تہذیبی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور حیدرآبادی کھانے ہندوستان بھر میں اپنے ذائقے کی بناپر ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔یہی نہیں حیدرآبادیوں کی میزبانی اور تواضع اور مہمان نوازی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

یہاں کے امراء پائیگاہوں کی کوٹھیوں میں ماہر پکوان باورچی مامور ہوتے تھے۔ عموماً صاف ستھرے چھاپے یالال مدرے کے دستر خوان فرش پر بچھائے جاتے اور خوبصورت مشقابوں اور برتنوں میں انواع واقسام کے پُر لطف اور لذیذ کھانے دستر خوان کی زینت بنتے۔ شہر کی مختلف ہستیاں جن میں علماء، فضلاء، فقراء، مشائخ، اہلِ سیف و قلم، ہر قوم وملت کے مہمان مدعو ہوتے اور کھانے تناول کرتے۔ حیدرآباد کی خوش خلقی، انکساری اور کسر نفسی مشہور تھی اور اب بھی ہے۔ چند ایک معروف ہستیوں کے دستر خوان مشہور ہیں مثلاً ماہ لقا بائی چندا، مہاراجہ کشن پرشاد، آصف جاہ ثانی نظام علی خاں، قدرت نواز جنگ، مظفر جنگ اور سیٹھ محمد موسیٰ وغیرہ۔

حیدرآبادی اچھے اور لذیذ کھانوں کے دلدادہ رہے ہیں۔ یہاں کے دستر خوان کی مشہور لوازمات، سفیدہ اور زردہ بریانیاں، پلاؤ، قبولی، کھچڑی، مرغ کا یخنی پلاؤ، بگھارے بیگن، مرچیوں کا سالن، شامی، شکم پور، ٹماٹے اور کلتھی کے کٹ، کتھلی، بے لمبو اور جھینگوں کا سالن، مرغ کا سالن اور قورمہ، مچھلی کا سالن جسے ماہی قلیہ بھی کہتے ہیں، دہی اور چاول کی کڑی، دالچہ، چاکھنا، بھیجے کا سالن، کڑھائی کے پسندے، نہاری کلیجے، دم کا مرغ، حلیم، جیب جبڑے، مرغ کباب، پتھر کا گوشت، ٹٹی کباب، مٹھی کباب، تاش کباب، کوفتے، قیمہ، کھچڑا، دہی بڑے، طوتک، آلو میتھی، قیمہ میتھی، آلو ٹماٹے، طرائی میتھی، مٹر آلو پنیر، پالک پنیر، انباڑہ چنادال میں، پالک آلو، چکا سویا، کلیجی سویا، خُرفے کی بھاجی، چگر، (ان سب میں کٹھاس زیادہ ہوتی) کُبٹ جو ناریل کے دودھ میں بنایا جاتا تھا، کریلے، خمرخ، کروندے، حرفہ ریوڑی، سوزنی کی پھلی دال میں، کدو کا بھیجہ، آلو کا بھرتہ، بیگن کا بھرتہ، چکولیاں، ستھریاں، چمکورے کی بڑیاں، انبوتی کی بھاجی، ٹنڈے کندوریاں (دونڈا کایا)، کھٹے سالنوں میں کھٹی دال، ماہی قلیہ، کدو دال، بیگن کا قلیہ، ترکاریوں میں ہر قسم کی ترکاری، گوشت یا قیمے کے ساتھ پکاتے ہیں۔ میتھی کی بھاجی اور کوتھمیر پودینہ ہری مرچ کے ساتھ ڈالنے سے سالن مزیدار ہو جاتے ہیں۔

روٹیوں میں روغنی روٹی، خمیری روٹی، کلچے، شیر مال، پراٹھے، تندوری روٹی، چپاتیاں، پھلکے، نان، ورقی پوریاں، ورقی سموسے اور لقمیاں۔

نہاری میں بکرے کے سر، پائے اور زبان ہوتے جو کلچے شیر مال یانان کے ساتھ کھائے جاتے، چاکنہ میں بکری کا سر، دل کلیجی اور اوجھڑی ڈالی جاتی جس میں لونگ کا پھول خاص ذائقہ دیتا ہے۔آج بھی ایک محلہ چاکھنہ واڑی مشہور ہے جہاں چاکھنہ بناتے ہیں۔

ناشتے میں انڈوں کا خاگینہ، یا تلے ہوئے انڈے، ڈبل روٹی، قیمہ پراٹھے، کھچڑی، پاپڑ، اچار، تل کی چٹنی، کھڑی مسور کی دال جو پھلکے کے ساتھ کھائی جاتی۔

مشہور ہے کہ کھچڑی کے چار یار: قیمہ، پاپڑ، گھی، اچار۔ اکثر گھرانوں میں یہ ''چاروں یار'' ناشتوں میں بڑے شوق سے دستر خوان کی زینت بنتے ہیں۔

دوپہر میں چاول لازمی ڈش ہوتی اور گیہوں یا جوار کی روٹی استعمال ہوتی۔ مختلف دل پسند سالنوں کے ساتھ پھلکے، چپاتیاں اور اچار کی چاشنی بھی ہوتی۔ اچار عموماً گیری، لیموں، بے لمبو، کمرخ یا خمرخ، ملونی ترکاری اور املی کے ڈالے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ حرفہ ریوڑی، گوشت، مچھلی، لہسن، کروندے اور ٹماٹے کے بھی اچار پڑتے ہیں۔ جوار کی روٹی اور تل کی چٹنی چٹخارے لے کر کھائی جاتی ہے۔ مٹھی کے کباب، سیخ کباب اور پتھر کے کباب، باقر خانی روٹی کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔

گرمیوں میں جب رسال آم کی بھرمار ہوتی ہے چاول، سیوئیاں، پوری کے ساتھ آم رس بنا کر کھایا جاتا ہے۔ وقت بے وقت مہمان آئیں تو ان کی تواضع فالسہ، لیموں، کیری، باگنگا اور فالودے کے مشروبات سے کی جاتی ہے۔

سردیوں میں مونگ پھلی یا موم پھلی اور بُھٹانے یا پھولے چنے کی دال تل کر پانی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ امراء کے پاس کاجو، بادام، چلغوزہ، اخروٹ، مصری، کشمش، منقّیٰ، پستہ، خشک میوہ پیش کرتے ہیں۔ خربوزے اور تربوز کے بیج بھی ان کے ساتھ شامل رہتے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب خلیل خاں فاختے اڑاتے تھے۔ اب تو ہر گھر میں صرف چائے بسکٹ، نمک پارے، پکوڑے یا مختلف قسم کے پاپڑ دیتے ہیں۔

میٹھے:

میٹھوں میں گاجر کا حلوہ، بادام کا حلوہ اور جالیاں، سوجی کا حلوہ، چونگے اور حب کا حلوہ، سوہن حلوہ، کدو کا حلوہ، کدو کے لوز، کاجو کی جالیاں، قلاقند، اجمیری قلاقند، جوزی حلوہ، پورن پوری، قوبانی کا میٹھا، گل فردوس، برفی، لڈو، رس گلے، گلاب جامن، سیویوں کا مزعفر، محبوبیاں، چاول، آلو اور رتالو کی کھیر، فیرنی، میسور پاک، فالودہ، ربڑی، چنے کا حلوہ، پوری اور آم کا مربہ۔ یہاں کے من پسند میٹھے ہیں۔

عید کے موقع پر شیر خرمہ اور سیویوں کا مزعفر دیا جاتا ہے۔ مختلف تقاریب اور شادی بیاہ میں لقمی کباب، شیر مال قورمہ، دو قسم کی بریانی یعنی سفیدہ اور زردہ بریانیاں، مرچی کا سالن یا بگھارے بیگن، دہی کی چٹنی اور میٹھے میں ڈبل کا میٹھا، بادام کا حلوہ یا جالیاں، قوبانی کا میٹھا۔ آج کل سبھی شادی کی تقریبوں میں دم کا مرغ، تندوری مرغ، چکن سوپ بھی لوازمات میں شامل ہیں۔ سفیدہ بریانی میں انڈے بھی ڈالے جاتے ہیں۔ کہیں زردہ بریانی بکری کے گوشت کی ہوتی ہے کہیں مرغی کے ساتھ پکائی جاتی۔ مرغ مسلم، پسندے، حلیم اور ہریس بھی ہوتے ہیں۔ آلو گوشت کا قورمہ، رومالی روٹی یا شیر مال بھی دی جاتی ہے۔

پہلے کھانے کے لوازمات پر چاندی کے ورق لگائے جاتے تھے خصوصاً دولھا کی میز پر لیکن اب قدرے کم ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ پان کے بیڑے یعنی گلوریاں سادہ اور میٹھے ورق لگا کر رکھے جاتے ہیں۔ میٹھے بیڑوں میں گل قند اور کھوپرے کا چوبہ ہوتا ہے۔ پان پر ورق لگا کر دینا حیدرآباد کا قدیم طریقہ ہے۔

پرانے دکھنی مخطوطات میں ''تشریف پانوں کی'' کہا گیا ہے یعنی پان دیکر عزت افزائی کرنا۔ گلبرگہ میں اب بھی کچھ گھرانوں میں رواج ہے کہ شادی کے موقع پر نیوتے کے دینے کی رسم ہوتی ہے تو ایسے ''پانوں کی تشریف'' ورق کے ساتھ دی جاتی ہے۔ بچوں کی بسم اللہ

کے موقعوں پر بڑے بڑے بوندی کے لڈو مغزیات اور گلاب کے پتیوں کے ساتھ تیار کیے جاتے ہیں۔

منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے دکھنی لوازمات کے علاوہ انگریزی، پرتگالی، چینی، ترکی، ایرانی اور عربی پکوان بھی دستر خوان کی زینت بن گئے ہیں۔ انگریزیت پسند طبقہ ترکاری سوپ اور مختلف گوشت اور مچھلی کی ڈش کھانا پسند کرتا ہے۔

پنجابیوں کے چھولے اور بمبئی والوں کی بھیل پوری کا بھی رواج ہو چلا ہے۔ دوسے، وڈے، اڈلی سانبھر، اتاپم اور اُپما بھی شوق سے کھانے لگے ہیں۔

چائے:

حیدرآبادی چائے کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ جہاں بھی ہو، جو وقت بھی ہو چائے ان کی ہم نشین ہوتی ہے۔ یوں تو چائے گھروں میں بھی بنتی ہے مگر ہوٹلوں میں ساتھیوں کے ساتھ چائے پینے کا اور ہی مزہ ہوتا ہے۔ خصوصاً ایرانی ہوٹلیں حیدرآبادی تہذیب کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد یہاں کی ذائقہ دار، فرحت بخش اور خوشبودار چائے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پتھر کا گوشت اور ٹٹی کا گوشت جس کے ساتھ قہوے چلتے ہیں۔ حیدرآبادیوں کو بہت مرغوب ہوتے ہیں۔ قہوہ، کافی کے بیج، سونٹھ، الائچی اور دار چینی ڈال کر بنایا جاتا ہے۔ جس برتن میں یہ بنایا جاتا ہے اسے ''ڈلّہ'' کہتے ہیں۔

فنجان سے قہوے کی چسکیاں لی جاتی ہیں جسے عام طور پر گھاوا کہتے ہیں۔

غذائی عادتیں:

تلنگانہ کے لوگوں کی بنیادی غذا چاول رہی ہے۔ یہاں چاول افراط سے پیدا ہوتا ہے۔ چاول کی ہری بھری دھن مڑیاں تاحدِ نظر دیکھنے والوں کو خوش کر دیتی ہیں اس لیے یہ محاورہ چل نکلا ہے کہ ''دل کی خوشی دَھن مڑی''

ہری بھری دھن مڑیوں میں سرخ ٹخنوں سے اونچی ساڑیاں پہنی ہوئی عورتیں دور سے ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہلی بارش کے بعد ہریالی میں ''بیر بہوٹیاں'' پھیل گئی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ چاولوں کی قسموں کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اکلو، رام ساگر، دھرم ساگر، نانک رام، کالا بھات، باسمتی، انبامور، سونا مسوری، امرتسر، دہرہ دون سب چاولوں کی مختلف قسمیں ہیں۔

مرہٹواڑہ میں جہاں گیہوں اور جوار کی افراط ہوتی ہے، وہاں کی بنیادی غذا روٹی۔ بھاکڑی (جوار کی روٹی) اور سنگھٹی (باجرہ کی روٹی) ہوتی ہے۔

کرناٹک میں جوار زیادہ ہوتی ہے اور بہت عمدہ۔ اس لیے ان کی بنیادی غذا جوار کی روٹی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لال اور پیلی جوار کی پیداوار بھی ہوتی ہے جو مویشیوں کی غذا بنتی ہے۔

جوار کے ''ڈنٹھل'' کڑوی کہلاتی ہے جو مویشیوں کے کام آتی ہے۔ جوار کے بھٹے پکنے لگتے ہیں تو کھیتوں میں کام کرنے والے ہر آنے جانے والوں کی تواضع ''گڑ اور ہُلڈا'' یعنی جھلسے ہوئے بھُٹوں سے کی جاتی ہے۔ اس طرح گنّے کے کھیتوں میں فصل پر جب کڑھاؤ میں ''راب'' (شیرہ) پکایا جاتا ہے تو مٹی کے کٹوروں میں گرم راب میں گھی ڈال کر ہر ایک کو دیا جاتا ہے۔

مرغوب موسم کے باعث چونکہ طبیعت میں صفرہ پیدا ہوتا ہے۔ لوگ املی کی کھٹائی تلنگانہ میں زیادہ دوسرے علاقوں میں کم کم سہی مگر ضرور استعمال کرتے ہیں۔ فصل پر املی کا ''توک'' (اچار) بنایا جاتا ہے جو سال بھر کام آتا ہے۔ املی کا کونلا پتہ جسے چگر کہتے ہیں مختلف طریقوں سے پکایا جاتا ہے اس کا پھول بھی سالنوں میں کام آتا ہے۔

ادرک کا مربّہ، کریلے اور سوزنی کی پھلی بھی کھائی جاتی ہے۔ چگر کا پتہ گوشت اور بمبل مچھلی کے ساتھ، مرغ کے ساتھ، بوٹی یعنی اوجھڑی کے ساتھ، بیگن اور آلو کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ چھوٹی پَر کلی مچھلیاں جنہیں سوکنے پر نتھنی مچھلی کہا جاتا ہے، اس کے ساتھ بھی پکایا جاتا ہے۔ گرمی کے موسم میں چگر خرید کر نمک ڈال کر سکھایا جاتا ہے۔ اور بڑیوں کی صورت میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ آغاز برسات میں جب مرگیسر اکارتی شروع ہوتی ہے لوگ مرل مچھلی کا سالن ضرور کھاتے ہیں جو گوشت خور نہیں ہوتے وہ اس دن ہینگ گڑ کے ساتھ نگلتے ہیں۔

شردیاشرت (کارتی) کی چاندنی رات میں بھینس کے کچے دودھ کو پھینٹ کر جھاگ بنایا جاتا ہے اور رات بھر کھلے آسمان کے نیچے جھانپ میں رکھا جاتا ہے اور ''نمش'' بنایا جاتا ہے۔ اس میں پسی ہوئی الائچی ڈالی جاتی ہے۔ سویرے اسے شیر مال، نان یا کلچے کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سے اختلاجِ قلب نہیں ہوتا۔

اگادی کے زمانے میں نئی املی، خشخاش، گڑ کا پچرس بنایا جاتا ہے جسے ''ٹھنڈائی'' بھی کہتے ہیں۔

سردیوں میں باجرے کی گھاریاں اور سنگھٹی بنائی جاتی اور گرمیوں میں جواری سے۔ اس طرح سردیوں میں گنگنی کی کھچڑی گھی کے ساتھ کھائی جاتی ہے جس کے دانے رائی کی طرح ہوتے ہیں اور کلتھی کا کٹ بنایا جاتا ہے۔ اکثر گھرانوں میں لہسن کی ترکاری کھائی جاتی ہے۔ اکتوبر کی ابتداء میں لہسن بوتے ہیں اور نومبر کے آخر یا دسمبر میں انہیں نکال کر کچا لہسن اور ہری پیاز کی پتّیاں قیمے اور انڈوں میں پکائی جاتی ہیں اور خمیری روٹی کے ساتھ کھائی جاتی۔ اسے میتھی کی کھچڑی کے ساتھ گھی ڈال کر بھی کھاتے۔ اس موسم میں تیتر بٹیر بھی کھاتے ہیں۔ باہر سے حیدرآباد میں آکر بسنے والوں کو بھی یہ غذائی عادتیں رفتہ رفتہ موہ لیتیں۔ چنانچہ عرب، پٹھان، راجپوت اور لبّے آبادی کا جز بن گئے۔ پٹھانوں اور روہیلے کے کھانوں سے ''آب جوش''، ''شب دیگ'' اور ''شلجم کا سالن'' دستر خوان کی زینت بن گئے۔

میوے یا پھل:

حیدرآباد میں ہر موسم کے لحاظ سے مختلف میوے بازار میں آتے ہیں، مثلاً موز (کیلا)، سنترہ، موسمبی، آم، انار، سیب، چیکو (سپوٹا)، جام (امرود)، نارنگی، انجیر، خربوزہ، تربوز اور پپائی یا پپیتا۔

ریاست میں انگور اور عناب شاہی اور بے دانہ انگور کی شوقیہ کاشت کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ جامن، سیتا پھل، گینگل، سندولے، منجل، بیر، سوابیر اور کویٹ یہاں کے قدرتی پھل ہیں۔

کرناٹک کے کملاپور سے سرخ موز بھی آتے تھے مگر اب کمیاب ہیں۔ پیلے چھینٹے دار موز، لونگیا موز، پتلے پوست والے پیلے سوہن موز زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ سبز موز عام طور پر سستے ملتے ہیں۔

اورنگ آباد کے نازک اور ٹیڑھے موز بھی مشہور ہیں۔ ذائقے کے لحاظ سے بہت اچھے ہوتے ہیں جن کا دہلی کے مشہور شاعر امیر خسرو کے اشعار میں حوالہ ملتا ہے کہ محبوب کی ابرویں کیلوں جیسی ہیں۔

محبوب نگر کا سیتا پھل لاجواب سمجھا جاتا ہے۔ فوجی عربوں نے اپنی بستیوں میں امرود اور انجیر کی کاشت کے خاص ڈھنگ برتے ہیں۔ عرب بستی میسرم کا جام اور انجیر دونوں لاجواب ہوتے ہیں۔

حیدرآباد ریاست کے لوگوں میں میوؤں کے باغ لگانے کا شوق بہت پرانا ہے۔ شہر کے اطراف بے شمار پھلوں کے باغ تھے چنانچہ اطراف بلد کا پرانا نام ہی ''ضلع باغات'' تھا جسے اب ضلع رنگاریڈی کہا جاتا ہے۔

ان باغوں میں آم کی کئی پیوندی قسم کے تجربے کیے گئے۔ شکر گٹلی، تخمی اور پیوندی (قلمی) سیندوری، بے نشان، ملغوبہ، محمودہ، جہانگیری، حمایت پسند، پدّا اور چنار سال، نیلم، ملکہ، لنگڑا، طوطاپری، شاہ پسند، کالا پہاڑ، سورن ریکھا، سرخی مائل آم، اعظم الشمر وغیرہ بہت شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ بعض آم ملکہ برطانیہ کے لیے بھی بھجوائے جاتے تھے۔

آم کا بازار سالانہ پنچ محلہ میں لگا کرتا تھا جہاں عمدہ قسم کے رس کے آم ملتے تھے۔ جو خانگی باغوں کے ہوتے تھے۔ آم کے شوقین اس بازار کا پھیرا ضرور لگاتے تھے۔ اب طرح طرح کے آم اگانے کا تجارتی نقطہ نظر ہو گیا ہے۔

رس کے آموں میں بجواڑے کے ''پدّا رسال'' کی دھوم ہے اور قلمی آموں میں بے نشان کی بہتات ہوتی ہے مگر شکر گٹلی کی کمی ہوتی ہے۔

طوطاپری ٹھیلوں پر اسکولوں کے سامنے دکھائی دیتے ہیں جہاں بچے چاٹ مسالے اس کے پھانکوں سے لگا کر کھاتے ہیں۔

سب سے آخر میں نیلم آم آتا ہے۔ کہیں کہیں گھروں میں ''گدھا مارو'' کے پیڑ نظر آتے ہیں جو کھانے کے کام کے نہیں بلکہ ان سے اچار بنائے جاتے ہیں۔

اچار:

مئی کے وسط میں بازار میں ''کالی کیری'' آتی ہے جو اچار کے بنانے کے کام آتی ہے۔ اچار کی کمپنیاں یہ کیریاں خریدتی ہیں۔ دودھ باؤلی کے بازار والے اس کی پھانکیں نمک میں ڈال کر رکھ دیتے ہیں۔ اچار بنانے والے ان کو خرید کر مسالے سے بگھار لیتے ہیں۔

عام طور پر اچار کا مسالہ رائی سے بناتے ہیں لیکن بعض لوگ ادرک استعمال کرتے ہیں رائی نہیں ڈالتے۔ اس کے علاوہ لیموں، بے لمبو، کروندہ، نارنگی کے اچار ڈالے جاتے ہیں۔

تلسنکرات کے بعد املی پکنے لگتی ہے تو املی کا تُوک بنایا جاتا جو کئی برس تک اچھا رہتا ہے۔ بعض لوگ اسے بغیر بگھارے کھاتے ہیں بعض چٹنی سے اور بعض بگھار کر اچار کی طرح کھاتے ہیں۔

مختلف ترکاری اور گوشت کے اچار، انڈوں، مچھلی، کریلے، امباڑے کی بھاجی، ٹماٹے اور ملواں ترکاری کے اچار ڈالے جاتے ہیں۔ کیری میں بھی بڑی پھانک کا اچار اور رشتے کا اچار ڈالتے ہیں۔ بعض کیری کو چوبے کی طرح گھس کر اچار کے مسالے سے بگھارتے ہیں۔

شمالی ہند میں ''لسوڑے'' کا اچار، گاجر کا اور شلجم کا پانی والا اچار بناتے ہیں۔ ریاست حیدرآباد میں مرہٹواڑے اور تلنگانہ کے اچاروں میں مختلف مسالوں کی وجہ سے ذائقے کا فرق ہوتا ہے۔

پھول:

کرناٹک میں خوشبودار پھول جیسے موتیا، چنبیلی کے بے شمار باغیچے تھے۔ گلبرگہ میں خوشبودار سر کا مسالہ، آگر بڑیاں، برمکی عود، لوبان صندل اور عطریات کا بڑا بازار تھا جن کے لیے خوشبودار پھولوں کی کاشت بھی اطراف میں ہوتی تھی جن کی جڑوں سے سر دھونے کا مسالہ بنایا جاتا تھا۔

گلبرگہ سے یہ ساری چیزیں حیدرآباد ریاست میں فراہم کی جاتی تھیں چنانچہ گلبرگہ کے بازاروں کا نام ہی ''عطار گلی'' اور صندل گلی'' پڑ گئے تھے۔

حیدرآباد میں ''کیوڑا بن'' تھا۔ برسات میں لڑکیاں اپنی چوٹیوں میں اسے استعمال کرتی تھیں اور پوری فضا مہک جاتی تھی۔

شہر حیدرآباد میں ایسی چیزوں کے ملنے کی جگہ ''لاڈ بازار تھی'' اور آج بھی اسی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

پان:

عورتیں پان کھانے کی بے حد شوقین تھیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ضلع گلبرگہ کے موضع ''دودمنی'' کے پان بے حد نرم اور ملائم ہوتے مگر بعض شائقین کو تلنگانہ کے ورم پاڑ کا بڑا کرارا چکلا پان زیادہ پسند آتا ہے۔ عام طور پر نرم کلی دار پان بھی پسند کیے جاتے ہیں۔ جو بجئے واڑا سے آتے ہیں اور ہلکے سبز رنگ کے ہوتے ہیں۔ شمالی ہند کے بنارسی پان اور لونگیا، مہوا، کھنڈوا بھی پسندیدہ رہے ہیں۔ پان کا ذکر دکھنی کے اکثر گیتوں میں ملتا ہے جیسے:

چُنے چُنے چاول کا خاصہ پکائی　　پکے پکے پانوں کے بیڑے لگائی
کچی کچی کلیوں کے گجرے گندھائی　　ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے صُرایاں بھرائی

ہندو اپنی بیٹیوں کو ''پان پٹّی'' کے نام سے تھوڑی زمین دیا کرتے تھے اور مسلمان اپنی بیٹیوں کو ''پاندان خرچ'' یا ''میوہ خوری'' کے نام سے کچھ نہ کچھ رقم ماہانہ ادا کرتے تھے۔

محرم میں مسلمان عورتیں کم از کم ایک عشرہ تک پان سے پرہیز کرتی تھیں اور سُکھ مُکھ جس میں دھنیے کی گری کے ساتھ ککڑی، تربوز اور خربوزے کے بیج اور کھوپرے کا چوبہ شامل ہوتا، استعمال کرتیں۔

شام کے وقت ہر پُل پر پھول والے اور پان والے بیٹھے رہتے اور وہاں سے گزرنے والے ایک پھولوں کا دونا اور ایک گچی پان ضرور خریدتے تھے۔

حیدرآباد کے پاندان بھی خاص وضع کے ہوتے تھے جو باہر سے آنے والے بطور سوغات لے جاتے تھے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)
1۔ حیدرآباد کے کون کون سے پکوانوں کا ذکر مصنفہ نے کیا ہے؟
2۔ شادی بیاہ اور دیگر تقاریب میں کون کون سے پکوانوں سے مہمانوں کی عام طور پر تواضع کی جاتی تھی؟
3۔ چائے اور پان کے سلسلے میں کیا بات کہی گئی ہے؟

2.3 متن(۲)چار مینار۔دور اہے پر(The Era of Muslim Leadership)

پچھلے ہفتہ ایک ہی دن میں ہمیں چار مینار کے بارے میں دو متضاد اطلاعات ملیں۔ پہلی اطلاع تو 'ٹائمس آف انڈیا' کے ذریعہ یہ ملی کہ حیدرآباد کی اس تاریخی عمارت کو ٹریفک کے مضر اثرات سے بچانے کے لیے اس کے اطراف جو حصار حال ہی میں باندھا گیا ہے، غالباً اس کی تعمیر کے نتیجہ میں اس عمارت میں دراڑیں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ کہ اس تاریخی عمارت کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ نامہ نگار نے اس تشویش کا اظہار بھی کیا ہے کہ اگر چار مینار کی بروقت مرمت نہ کی گئی تو یہ عمارت، جس سے حیدرآباد آج ساری دنیا میں پہچانا جاتا ہے، برباد ہو جائے گی۔ اس اطلاع کو پڑھ کر ہمیں دہلی کی ایک پرانی تقریب کی یاد آگئی جس میں ہمارے بے حد مخلص اور عزیز ترین دوست شرد دت نے جو غلو کرنے میں بھی خاصا غلو کر جاتے ہیں ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ حیدرآباد کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ ایک چار مینار اور دوسرے مجتبیٰ حسین۔ ہم تو خیر اس تعارف پر ہنس کر خاموش ہو گئے تھے کیونکہ ایسی باتیں ہنسنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ تاہم اب جب کہ ہماری موجودہ حالت خود چار مینار کی سی بلکہ چار مینار سے بھی ابتر ہوتی جارہی ہے تو اس اطلاع کو پڑھ کر ایک لمحہ کے لیے خود ہماری تشویش میں بھی اس خیال سے اضافہ ہو گیا کہ اگر خدانخواستہ چار مینار کو کچھ ہو گیا تو حیدرآباد کی پہچان بننے کی ذمہ داری کہیں اکیلے ہم پر عائد نہ ہو جائے اور اب جب کہ خود ہماری حالت دگرگوں ہوتی جارہی ہے تو ایسے میں ہم اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ کو کیسے سنبھالیں گے۔ لہٰذا حیدرآبادیوں سے بلا تکلف یہ کہنے کو جی چاہ رہا ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہمارے بھروسہ بالکل نہ رہیں اور چار مینار کی حفاظت کریں۔ آدمی بھی کیسی مضحکہ خیز خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دن بھر چار مینار کی عمارت آنکھوں میں گھومتی رہی۔ تاہم شام کو ہم نے ٹیلی ویژن کھولا تو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ حکومت آندھرا پردیش نے شام کے وقت چار مینار کو روشن اور منور کرنے کی غرض سے لاکھوں روپیوں کی کثیر رقم خرچ کر کے روشنی کا خصوصی بندوبست کیا ہے۔ یہ روشنی اتنی تیز ہو گی کہ چار مینار کے سارے گوشے منور ہو جائیں گے اور اس کی خوبصورتی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ دیکھنے والے پر عیاں ہو جائے گی۔ (ہمارا یہ مشورہ ہے کہ یہ روشنی اتنی تیز نہ رکھی جائے کہ چار مینار کی عمارت میں پڑی ہوئی دراڑیں سیاحوں کو نظر آجائیں۔ اس لیے کہ چار مینار میں پڑی ہوئی دراڑیں بھلے ہی چار مینار کی طبع نازک پر گراں نہ گزریں لیکن دیکھنے والوں کی طبع نازک پر تو گراں گزر سکتی ہیں۔ ہمیں عمارت سے کہیں زیادہ سیاحوں کی فکر کرنی چاہیے۔)

ان دو اطلاعات کے پس منظر میں چار مینار کا خیال آیا تو بس آتا ہی چلا گیا۔ ماشاءاللہ اس عمارت پر سے اب تک چار صدیاں اور کچھ برس بیت چکے ہیں اور ہم نے لگ بھگ ساٹھ برس پہلے اس عمارت کو اُس وقت دیکھا تھا جب ہم خود سات آٹھ برس کے تھے اور اپنے ایک بھائی کے ساتھ حیدرآباد کی سیاحت کرنے کی غرض سے پہلی بار گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تھے۔ اگرچہ اس پر شکوہ عمارت کو دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے تھے۔ تاہم ہمارے بچکانہ ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوا تھا کہ اس عالیشان عمارت میں کون رہتا ہو گا اور اگر رہتا ہو گا تو اپنا سامان کہاں رکھتا ہو گا اور اگر سامان رکھتا ہے تو اس سامان کی حفاظت کون کرتا ہو گا کیونکہ چار مینار میں ہمیں کہیں ایسا کوئی دراوزہ وغیرہ نظر نہیں آیا تھا جسے باہر جاتے وقت بند کیا جاسکے تاکہ اس کا سامان اس عمارت میں محفوظ رہ سکے۔ ہم نے اس خصوص میں جب اپنے بھائی سے کئی بچکانہ سوالات پوچھنے شروع کیے تو ہر سوال کے جواب میں انہوں نے ہمیں ایک ٹافی دے کر خاموش کرادیا۔ تاہم ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے اس پہلے سوال پر کہ

اس عمارت میں کون رہتا ہے، انہوں نے ٹافی دیئے بغیر ہم سے کہا تھا ''اس عمارت میں حیدرآباد رہتا ہے'' اس پر ہم نے پوچھا تھا ''حیدرآباد اس عمارت میں کرایہ سے رہتا ہے یا یہ عمارت اس کی ذاتی ملکیت ہے اور اگر یہ عمارت اس کی ذاتی ملکیت ہے تو اس کا دیوان خانہ کہاں ہے، خوابگاہ اور غسل خانہ کہاں ہے۔ ہمیں تو یہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ بیچارا حیدرآباد بڑی مشکل سے یہاں رہتا ہوگا'' اس سوال پر انہوں نے ہمیں زوردار ڈانٹ پلائی تھی۔ اس زمانہ کی حیدرآبادی تہذیب میں اس طرح کی ڈانٹ کے دو ہی مطلب ہوا کرتے تھے۔ پہلا مطلب تو کہ بچے بڑوں سے ایسے بیہودہ سوالات نہ پوچھیں اور دوسرا مطلب یہ کہ جس سے یہ سوال پوچھا جارہا ہے وہ خود بھی اس کا جواب نہیں جانتا۔

کچھ برس بعد جب ہم حیدرآباد میں رہنے لگے تو یہ عمارت ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن گئی۔ یہ اور بات ہے کہ حیدرآباد میں ایک لمبا عرصہ گزارنے کے باوجود ہم کبھی چارمینار کے اوپر نہیں چڑھے۔ البتہ 1980ء میں ٹوکیو یونیورسٹی میں ہماری ملاقات ایم۔اے (اردو) کی طالبہ شاشوؔرے سے ہوئی تھی جو کچھ عرصہ پہلے ہی حیدرآباد کی سیاحت سے فارغ ہو کر ٹوکیو لوٹی تھیں۔ انہیں جب یہ پتہ چلا کہ ہمارا تعلق حیدرآباد سے ہے تو انہوں نے چارمینار کی تعریف کرنے کے بعد ہم سے خواہش کی تھی کہ اگر کبھی ہمارا حیدرآباد جانا ہو تو ہم چارمینار کے لاڈ بازار کی سمت والے مینار پر اُردو رسم الخط میں ان کا نام ضرور تلاش کریں کیونکہ انہوں نے وہاں اپنا نام لکھ رکھا تھا۔ عرض کیا کہ آپ کو وہاں اپنا نام لکھنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوگئی، تو موصوفہ نے فرمایا ''میں جب اوپر گئی تو دیکھا کہ کچھ اور سیاح پہلے ہی سے اس مینار پر اپنے نام اور پتے وغیرہ لکھنے میں مصروف تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید ہندوستان میں تاریخی عمارتوں کو 'تصنیف وتالیف' کے کام کے لیے استعمال کرنے کی روایت موجود ہے۔ لہٰذا میں نے بھی اپنا نام وہاں لکھ دیا تھا۔ اس وقت تو ہم ہنس کر خاموش ہوگئے لیکن ٹوکیو سے واپسی کے بعد جب ہمیں حیدرآباد جانے کا موقع ملا تو ہم نے اپنے ایک دوست کو اس مہم پر چارمینار کی چھت پر روانہ کیا تھا کہ وہ وہاں اس نام کو تلاش کرآئیں۔ مگر جب ہمارے یہ دوست خالی ہاتھ چارمینار کے اوپر سے ہانپتے ہانپتے نیچے آئے تو ہم پر بہت برہم تھے۔ کہنے لگے ''میاں ایک خاتون کی فرمائش پر فرہادؔ تیشہ بدست پہاڑ پر چڑھ گیا تھا کہ پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر لے آئے گا۔ تم سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ خود چارمینار پر چڑھ جاتے اور اپنی دوست کا نام وہاں تلاش کرلیتے۔ میری ٹانگیں الگ سے تڑوائیں اور گوہر مقصود بھی ہاتھ نہ آیا'' بعد میں ہم نے ایک ذمہ دار دوست کی طرح شاشوؔرے کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ چارمینار پر ان کا تصنیف کردہ نام موجود نہیں ہے۔ اتفاق سے چار پانچ برس بعد وہ خود حیدرآباد آئیں تو چارمینار کے اوپر جانے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ مگر افسوس کہ اس وقت تک چارمینار کے اوپر جانے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ پتہ چلا کہ کچھ عاقبت نااندیش لوگوں نے اس عمارت پر سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کا آسان اور سستا طریقہ ایجاد کرلیا ہے بلکہ ایک خبر تو ایسی بھی پڑھنے کو ملی تھی کہ خودکشی کرنے کے خواہشمند ایک شخص نے پوری صدق دلی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اوپر چلے جانے کے ارادہ سے اس عمارت پر سے چھلانگ تو لگائی تھی لیکن جب وہ نیچے آیا تو وہاں سے گزرنے والے ایک معصوم سائیکل سوار پر جا گرا۔ نتیجہ میں سائیکل سوار تو مر گیا اور خودکشی کرنے کا بدقسمت خواہشمند بچ گیا۔ تب ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ عمارت تو بالکل ہی بے مصرف، نکمّی اور ناکارہ ہے کیونکہ اس میں رہنا اور بسنا تو بہت دور کی بات ہے، اس پر سے تو آدمی چھلانگ لگا کر ڈھنگ سے مر بھی نہیں سکتا۔ تب ماننا پڑا کہ یہ عمارت تو صرف ایک علامت ہے۔ جیسے ادب برائے ادب اور آرٹ برائے آرٹ ہوتا ہے اسی طرح یہ عمارت بھی 'عمارت برائے عمارت' ہے اور اس کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ ایک عرصہ تک ہم اس عمارت کو ٹریفک کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہی سمجھتے رہے کیونکہ چوراہے کے عین بیچوں بیچ اتنی بڑی عمارت کو کھڑا کردینے کا

اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ یادش بخیر! ایک زمانہ میں 'چار مینار کی گپ' کا بھی بڑا شہرہ تھا۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات کو دور دور تک پہنچانے کے لے یے اینٹینا (Antenna) ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ تب حیدرآباد کے گپ باز، یعنی اس زمانہ کے میڈیا والے، اس عمارت کے میناروں کو بطور اینٹینا استعمال کر کے کسی بھی گپ یا افواہ کو سارے شہر میں پھیلا دیتے تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بسا اوقات بعد میں یہ افواہیں سچ بھی ثابت ہو جاتی تھیں۔ گویا یہ گپ باز آج کے میڈیا والوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل بھروسہ ہوا کرتے تھے۔

مانا کہ یہ عمارت بے مصرف ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ عمارت حیدرآباد کی واحد پہچان اور علامت ہے۔ یہ عمارت اس وقت سے موجود ہے جب یہ شہر آباد ہوا تھا۔ اس عمارت نے قطب شاہوں کا دور دیکھا، مغلوں کا اقتدار اور آصف جاہوں کا عہد دیکھا۔ انگریزوں کے اقتدار کو جھیلا اور اب جمہوریت کے تماشے دیکھ رہی ہے۔ اس نے حیدرآبادی تہذیب کے عروج کا زمانہ دیکھا اور اب اس کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی عینی شاہد ہے۔ قلی قطب شاہ نے جب چار مینار کو تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو اس وقت ملک میں 'قطب مینار' پہلے ہی سے موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مینار قطب الدین ایبک سے منسوب تھا۔ قلی قطب شاہ چاہتا تو چار مینار کے چاروں میناروں کو ملا کر 'قطب مینار' سے کہیں زیادہ اونچا مینار بنوا سکتا تھا لیکن اس نے بہت سوچ سمجھ کر چار سمتوں کو ذہن میں رکھ کر چار یکساں قد و قامت والے میناروں کو اس عمارت سے جوڑ دیا تھا کہ میاں میناروں! جب تک رہو امن اور شانتی کے ساتھ مل جل کر رہو، خوش رہو اور اس عمارت سے جڑے رہو۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس شہر کے موجودہ لوگ قلی قطب شاہ کے اس پیغام پر کتنا عمل کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی ان میناروں میں اختلاف رائے پیدا ہوتے نہیں دیکھا۔ کبھی کسی مینار نے دوسرے مینار کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اسے نیچا کر دکھانے کی کوشش کی۔ کتنے ہی حیدرآبادی اس شہر کو چھوڑ کر دنیا بھر کے کئی ملکوں میں جا بسے لیکن یہ مینار بدستور اس عمارت سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس عمارت کی تعمیر میں ایک ایسا اٹوٹ اتحاد پوشیدہ ہے جو کسی معاشرے میں دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اس عمارت کے چاروں طرف جو گھڑیاں لگائی گئی ہیں ان میں ایک زمانہ میں ہمیں کبھی 'اتفاق رائے' نظر نہیں آیا۔ ہر گھڑی کا وقت دوسری گھڑی کے وقت سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ ہمارا یہ مشاہدہ بھی اُن دنوں کا ہے جب ہم حیدرآباد میں رہا کرتے تھے اور دستی گھڑی خریدنے کی خود میں سکت نہیں رکھتے تھے۔ اب کا حال ہم نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ یوں بھی یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کیونکہ محمد قلی قطب شاہ نے جب یہ عمارت تعمیر کروائی تھی تو اس وقت اس عمارت میں گھڑیاں تھیں ہی نہیں۔ بعد کے 'ابن الوقتوں' نے اس عمارت میں ان گھڑیوں کا اضافہ کر دیا۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)

1۔ مصنف کو کیوں حیدرآباد کی پہچان سے جوڑا جاتا ہے؟

2۔ ٹوکیو یونیورسٹی کی طالبہ کے قصہ کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

3۔ آپ نے اگر کسی تاریخی عمارت کی سیر کی ہے، تو اس کی تفصیلات کو قلمبند کریں۔

2.4 خلاصہ (Summary)

متن ۱: حیدرآبادی دسترخوان (O Human! Realize the Value of Time)

یہ متن حیدرآباد کی کھانے پینے اور دستر خوان کی روایات پر روشنی ڈالتا ہے۔ حیدرآبادی دستر خوان تہذیب، مہمان نوازی، اور کھانوں کی مختلف اقسام (گوشت، سبزی، میٹھے، چائے، پان اور پھل) کے حوالے سے مشہور ہیں۔ مصنفہ نے مختلف موسموں میں مخصوص کھانوں اور میٹھوں کے استعمال، شادی بیاہ اور تقاریب میں کھانوں کی اہمیت، اور حیدرآبادی غذائی عادات کی تاریخی اور علاقائی تفصیلات بیان کی ہیں۔

متن ۲: چارمینار۔ دوراہے پر (The Era of Muslim Leadership)

یہ متن چارمینار کی تاریخی اہمیت، تحفظ، اور شخصی تجربات بیان کرتا ہے۔ مصنف نے چارمینار کے مختلف پہلوؤں، ٹریفک کے اثرات، مرمت کی ضرورت، سیاحتی یادیں، اور انسانی دلچسپی کے واقعات بیان کیے ہیں۔ چارمینار کی علامتی حیثیت، ثقافتی قدر اور حیدرآبادی زندگی میں اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ دونوں متون میں لسانی، اسلوبیائی اور جمالیاتی پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ طلبہ بیانیہ اور وضاحتی متون کو بہتر سمجھ سکیں اور بیان کر سکیں۔

2.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں ہم نے سیکھا:

- متون کے مرکزی خیال اور تفصیلات کو سمجھنا۔
- وضاحتی اور معلوماتی متون کو زبانی اور تحریری طور پر بیان کرنا۔
- متون کے لسانی (linguistic)، اسلوبیائی (stylistic) اور جمالیاتی (aesthetic) پہلوؤں کی نشاندہی کرنا۔
- تاریخی اور ثقافتی حوالوں کو متن سے مربوط کرنا۔
- مختلف کھانوں، روایات اور عمارات کے تاریخی اور معاشرتی پس منظر کو بیان کرنا۔

2.6 فرہنگ (Glossary)

لفظ	معنی/تعریف
دستر خوان	کھانے کی میز یا فرش پر بچھائے گئے کھانے کے انتظامات
تواضع	مہمان نوازی، ادب اور احترام سے خدمت کرنا
مشائخ	مذہبی اور روحانی رہنما
نہاری	گوشت اور مصالحے سے تیار کی جانے والی روایتی ہندی ڈش
چاکھنہ	خاص قسم کی کھانے کی ڈش جس میں گوشت اور مصالحے شامل ہوں
سفیدہ بریانی	سفید رنگ کی بریانی، عام طور پر چکن یا انڈے کے ساتھ
زردہ بریانی	رنگین اور میٹھی بریانی، عام طور پر خصوصی مواقع پر تیار کی جاتی ہے

فالودہ	ٹھنڈی میٹھی ڈش، عام طور پر گلاب اور نشاستے کے ساتھ
پاندان	پان خریدنے کے لیے مخصوص رقم یا تحفہ
مینار	بلند عمارت، یہاں چار مینار کی طرف اشارہ
گپ باز	خبر یا افواہ پھیلانے والا شخص، میڈیا کے سابقہ کردار کے طور پر
تصنیف و تالیف	کسی کام یا عمارت کو اس کے اصل مقصد کے لیے استعمال کرنے کا عمل
املی	کھٹی سبزی یا پھل، مختلف پکوانوں میں استعمال ہوتی ہے

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1۔ ''حیدرآبادی دستر خوان'' میں جتنے پکوانوں کے نام ملتے ہیں، اُن کی مکمل فہرست تیار کیجیے۔

2۔ آپ کے شہر / مقام پر کون کون سے پکوان دستر خوان پر ہوتے ہیں؟ بتایئے۔

3۔ مجتبیٰ حسین نے چار مینار سے متعلق جو باتیں اپنے مضمون میں پیش کی ہیں، اُن کو اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

1۔ طیبہ بیگم ''میرا حیدرآباد'' 2004

2۔ مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم مرتب حسن چشتی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوز، دہلی۔ 2001

اکائی 3۔ بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (حصہ سوم)

(Engaging with Narrative and Descriptive Accounts Part-3)*

اکائی کے اجزاء

3.0 تمہید (Introduction)

3.1 مقاصد (Objectives)

3.2 متن (۱): اے انسان! وقت کی قیمت پہچان

3.3 متن (۲): مسلمانوں کا دور قیادت

3.4 خلاصہ (Summary)

3.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

3.6 فرہنگ (Glossary)

3.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

3.0 تمہید (Introduction)

پچھلی دو اکائیوں میں ہم نے مطالعہ کے لیے مختلف متون دیئے تھے۔ آپ نے ان متون کے مطالعہ کے بعد غور کیا ہوگا کہ ہر متن کا اسلوب یعنی طرز تحریر مختلف ہے۔ مثال کے طور پر ''ذوق چائے نوشی'' میں ادبی اسلوب پایا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مضمون ''چار مینار۔ دوراہے پر'' مزاحیہ اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ ''حیدرآبادی دستر خوان'' انتہائی سادہ اسلوب کی مثال ہے۔ اس اکائی میں بھی دو متون دیئے گئے ہیں۔ پہلا متن ''اے انسان! وقت کی قیمت پہچان'' ہے۔ اس متن کو اسی عنوان پر مولانا رضوانالقاسمی کی تصنیف سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس میں انہوں نے وقت کی اہمیت کو نہایت پُراثر طور پر سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے تمثیلی اسلوب اختیار کیا ہے۔ دوسرا متن ''مولانا سید ابوالحسن ندوی کی تصنیف ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال'' سے ماخوذ ہے۔ یہ متن تاریخی معلومات پر مبنی ہے۔ مذکورہ متون کا بغور مطالعہ کیجیے اور پھر دی گئی سرگرمیوں کو پورا کیجیے۔

* Prof. Najmus Saher, Professor, Centre for Distance and Online Education, MANUU

3.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- متون کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔
- متون میں استعمال کی گئی ترکیبات، لفظیات اور اسالیب کی شناخت کر سکیں۔
- اس طرح کے دیگر موضوعات پر زبانی اور تحریری دونوں طرح اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔

3.2 متن(۱)اے انسان! وقت کی قیمت پہچان

یہ سطریں جس وقت لکھی جا رہی ہیں پرانا سال ۱۹۹۶ء جانے کو اور نیا سال ۱۹۹۷ء آنے کو تیار ہے، پہلا تاریخ کے دامن سے وابستہ ہو جائے گا اور دوسرا توقعات اور امیدوں کے شجر سے اپنا ارتباط قائم کر لے گا۔ ادیب، شاعر اور اہلِ قلم اپنے اپنے انداز میں جانے والے سال کو رخصت کرنے اور آنے والے سال کا استقبال کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میں قلم تھام چکے ہیں۔ ان کے قلم کے نتائج جب سامنے آئیں گے تو کہیں غم کے آنسو ٹپک رہے ہوں گے، تو کہیں خوشی کے پھول کھل رہے ہوں گے، کوئی واقعہ اچھا ہو گا اور اس کی خوشبو مشامِ جان کو معطر کر رہی ہو گی اور کوئی سانحہ ایسا ہو گا کہ بے ساختہ زبان پر آئے گا؛

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ان قلمی نتائج میں نئے سال کی نئے انداز میں مبارکباد بھی دی جائے گی اور کوشش کی جائے گی کہ مستقبل کے لیے حسین خوابوں کی دنیا بسائی جائے، اور خون کن خاکوں اور منصوبوں میں بہترین رنگ بھرا جائے، یعنی اس سلسلے میں جو آرزوئیں اور تمنائیں دل میں مچل رہی ہوں گی، ان میں شاعر کے دھڑکتے ہوئے دل کا یہ احساس ضرور شامل ہو گا۔

باندھی ہے ابد کے مصنوبے
کیا کلیجہ ہے عمر فانی کا

جب بھی نیا سال آتا ہے، بازار میں نوع بنوع اور رنگ بر نگ کے بکثرت فروخت ہونے والے کیلنڈر، اس کی ہماہمی اور دھوم دھام میں کافی اضافہ کر دیتے ہیں، اب گھروں میں آویزاں پرانا کیلنڈر نکالا جائے گا اور اس کی جگہ نیا کیلنڈر لگایا جائے گا، حساس دل شاعر کو نیا منظر ہمیشہ متاثر کرتا ہے۔ یہی تاثر ایک شاعر کی زبان سے یہ کہلواتا ہے:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی، اک اور گھٹادی

جب ہاتھ نیا کیلنڈر لیے پرانے کیلنڈر کو نکالنے کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک دوسرا شاعر آیا، آتے ہی اس نے کہا ذرا ٹھہرو، میری بات بھی سنتے جاؤ اور ہو سکے تو میرے اس ذہنی تاثر کو نئے سال کا نیا تحفہ سمجھو:

آہٹ بھی نہ محسوس ہوئی ختم سفر تک
یہ عمر روان کتنا دبے پاؤں چلے ہے

زمانہ کی تیز رفتاری:

شاعر نے جب یہ شعر پڑھا تو اس وقت ایک عالم دین بھی موجود تھے۔ انہوں نے موقع اور حالات کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث نقل کی کہ:

رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ زمانہ قریب نہ ہو جائے گا۔ یعنی زمانہ کی گردش تیز نہ ہو جائے گی اور دن و رات جلد جلد نہ گذرنے لگیں گے اور زمانہ کی تیز رفتاری اس کیفیت و حالت کے ساتھ ہو گی کہ سال مہینہ کے برابر، مہینہ ہفتہ کے برابر، ہفتہ دن کے برابر، دن ایک ساعت، یعنی ایک گھنٹہ کے برابر ہو جائے گا، اور ایک گھنٹہ اتنا مختصر ہو جائے گا جیسے آگ کا شعلہ گھاس کے تنکے پر سلگ جاتا ہے، یعنی جھٹ سے جل کر بجھ جاتا ہے"

شارحین حدیث نے یہ مطلب لکھا ہے کہ آخر زمانہ میں دنوں اور ساعتوں میں برکت کم ہو جائے گی، وقت اس قدر جلد اور تیزی کے ساتھ گذرتا معلوم ہو گا کہ اس کا فائدہ مند اور کارآمد ہونا معدوم ہو جائے گا یہ مراد ہے کہ اس زمانہ میں لوگ تفکرات اور پریشانیوں میں گھرے رہنے اور اپنے دل و دماغ پر بڑے بڑے فتنوں، نازل ہونے والے مصائب و آفات اور طرح طرح کی مشغولیتوں کا شدید تر دباؤ رکھنے کی وجہ سے وقت کے گذرنے کا ادراک و احساس تک نہیں کر پائیں گے، اور انہیں یہ جاننا مشکل ہو جائے گا کہ کب دن گذر گیا اور کب رات ختم ہو گئی۔

گورستان شاہی:

عالم دین جب اپنی گفتگو حدیث کی روشنی میں ختم کر چکے تو علامہ اقبال آئے اور اپنی مشہور نظم "گورستان شاہی" کے چند بند سنا گئے۔ ان کے انداز اور آواز میں درد تھا، عروج و زوال، اتار و چڑھاؤ اور دن و رات کے آنے جانے کی کہانی کو اپنی زبان شعری سے کچھ اس طرح بیان کر گئے کہ دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں، سنیے وہ کہتے ہیں:

آہ! جولانگاہ عالمگیر، یعنی وہ حصار — دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے — یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکان کہن کی خاک کا دل دادہ ہے
کوہ کے سر پر مثال پاسباں استادہ ہے
سوتے ہیں خاموش، ہنگاموں سے دور — مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک — جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل — جن کی تدبیر جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال
رعب فغفوری ہو دنیا میں، کہ شان قیصری — ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشت عمر کا حاصل ہے گور
جادہ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

روح مشت خاک میں زحمت کش بیداد ہے　　کوچہ گردنے ہوا جس دم نفس، فریاد ہے
زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوش نوا　　شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اڑ گیا
آہ! کیا آئے ریاض دہر میں ہم، کیا گئے　　زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحر ناپیدا کنار　　اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس! خوں رکہ ہے یہ زندگی بے اعتبار　　یہ شرارے کا تبسم، یہ خس آتش سوار
چاند، جو صورت گر ہستی کا اک اعجاز ہے　　پہنے سیمابی قبا محو خرام ناز ہے
چرخ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر　　بیکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقت سحر

اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے، جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار　　رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار　　رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوش روزگار
اسقدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں　　دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شئے کو قرار　　ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

ہے نگیں دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو

قیام اسی کا سمجھ غنیمت جو وقت پیش نگاہ اب ہے:

دل درد مند اور فکر ارجمند کے حامل شاعر اقبال کے بعد دانا اور حکیم شاعر اکبر الٰہ آبادی آئے، آتے ہی انہوں نے ایسی بات کہی، جس سے پرانے کیلنڈر کو نکالنے اور نئے کیلنڈر کو لگانے کے لیے ہاتھ اور قدم دونوں آگے بڑھے، ان کی بات بڑی حوصلہ افزاء تھی، اس ماضی کا معقول تجزیہ بھی تھا اور مستقبل کے لیے دانشمندانہ پیغام بھی، وہ گویا ہوئے:

گذر گیا ہے جو عہد عشرت، نہ رکھ تو ناداں پھر اس کی حسرت
قیام اس کا سمجھ غنیمت جو وقت پیش نگاہ اب ہے

یہ وقت کہاں جاتا ہے؟

اکبرؔ نے اپنے شعر ہی پر اکتفا نہیں کیا، وہ ایک سجی سجائی، جمی جمائی محفل میں اپنے ہاشم نامی بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ میاں! یہ تو بتاؤ یہ وقت جو چلا جاتا ہے آخر کہاں چلا جاتا ہے، روز کہا کرتے ہو کہ وقت گزر گیا، چلا گیا، وہ زمانہ رخصت ہو گیا، نیا سال آیا اور پرانے سال نے اپنی بساط لپیٹ لی، آخر ہے یہ کیا، لڑکا سوچ رہا ہے، اپنے باپ کو جواب دوں تو کیا دوں، چہرے پر غور و فکر کے نقوش ابھر آئے ہیں، مگر زبان ہے کہ ابھی ساکت و صامت ہے، باپ بیٹے کی ہچکچاہٹ اور گومگو والی کیفیت کو بھانپتے ہوئے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتا ہے، بیٹا! یہ وقت اللہ کے پاس چلا جاتا ہے، اور وہیں جمع ہو جاتا ہے، آج جمعہ گیا، کل سنیچر جائے گا اور پرسوں اتوار، یہ سب اسی طرح اللہ کے پاس جمع ہو جاتے ہیں، قیامت کے دن اللہ میاں وقت کو حکم دیں گے پھر سے آجا، بس یہ سارا وقت جو جمع ہوتا رہا ہے باہر نکل آئے گا اور جو کچھ وقت کے اندر کیا گیا ہے وہ سب آپ ہی آپ اس کے ساتھ باہر نکل آئے گا۔

اکبر کی اس مجلس میں ان کے ایک مدح خواں اور قدر داں مولانا عبدالماجد دریابادی بھی ہیں، اکبر جب مختصر لفظوں میں اپنے سوال کا خود ہی جواب دے کر خاموش ہو گئے، تو مولانا دریابادی اپنے دیرینہ، مخلصانہ اور خرد نوازانہ تعلقات کی بناء پر ان کے سوال و جواب کی مزید تشریح کے لیے اکبر سے اجازت چاہتے ہیں، خوشی سے یہ اجازت دے دی گئی، اب مولانا دریابادی حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''خوب غور کر کے دیکھیے آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں سب وقت ہی کے اندر تو کرتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، چلتے ہیں، سوتے ہیں، پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں، سب کچھ وقت ہی کے اندر تو کرتے ہیں، اگر وقت کے اندر واقعات کا گزر نا نہ ہو تو خود وقت کے گزرنے کے کوئی معنی ہی نہ رہ جائیں، پس وقت کا اعادہ جب کبھی بھی ہو گا تو مع اجزائے وقت کے ہو گا۔

اب ذرا حشر کے دن کا تصور کیجیے، آج کا دن وہاں پیش ہوا ہے اور آج کے دن کے پیشی کے ساتھ ہی ہماری عصری تباہ کاریاں جو ہم نے آج کے دن کی تھیں، وہ وہاں بھرے مجمع میں دوست دشمن سب کے سامنے پیش کر دی جائیں گی، فلاں کی غیبت کی، فلاں کی زباں درازی کی، فلاں پر ہاتھ چلا بیٹھے، فلاں سے فلاں معاملہ میں جھوٹ بولے، فلاں مزدور کی مزدوری مار لی، فلاں وقت کی نماز ٹال گئے، یہ ساری زندگی جسے ہم اپنے ذہن سے مدت ہوئی نکال چکے تھے، از سر نو بالکل تازہ ہو کر ہمارے سامنے آگئی ہے، کسی کا بیان اور کسی کی روایت نہیں ہے، خود ہم اپنے تئیں ٹھیک وہی کرتے ہوئے پا رہے ہیں، جہنم کی سختیوں کو چھوڑ کر شدائد یوم حشر کا ذکر نہیں، فرشتوں کا عذاب الگ رہا، آج اپنی خودداری اور عزت نفس کا وظیفہ دن رات وِرد زبان رہتا ہے، کل کی اس عالمگیر رسوائی سے کوئی پناہ دے سکے گا؟''

وقت کا حساب:

اکبر الٰہ آبادی کی باتوں کی وضاحت سے جب مولانا دریابادی فارغ ہوئے تو اپنے ہفت روزہ صدق جدید (۲۱ اپریل ۱۹۶۴ء) کے حوالے سے ایک اور اہم بات کی طرف توجہ دلائی، وہ یہ تھی:

''ڈیلی میل (لندن) مورخہ ۳ مارچ میں ایک گننے والے نے گن کر اور جوڑ کر بتایا ہے کہ برطانیہ میں اس وقت کھانے پینے کے سامان کی دکانیں چھ لاکھ ہیں، ان کے سامنے ہر گھر گرہستی والی خاتون کو اس وقت ایک گھنٹہ روزانہ انتظار میں کھڑا رہنا ہوتا ہے، گرہستی والیوں

کی تعداد اس وقت ایک کروڑ ہے تو اس حساب سے قوم کے دس کروڑ گھنٹہ روزانہ انتظار میں ضائع ہو جاتے ہیں، ان دس کروڑ گھنٹوں کے سال بنایئے، (۱۱۴۰) سال ہوتے ہیں گویا قوم کے ہاتھ (۱۱۴۰) سال کی روزانہ اضاعت! زندہ قوم کی ایک ایک چیز زندہ ہوتی ہے، اپنے منٹوں اور گھنٹوں کا یہ حساب رکھنا برطانوی قوم کی موت وپستی کی نہیں، زندگی وحرکت کی دلیل ہے۔

یہ ایک بالکل الگ سوال ہے کہ جس چیز کو وہ کام کی سمجھ رہے ہیں، خود اس کا کیا وزن اور کیا وقعت، آخرت کی میزان میں ہے؟ ہم آپ تو کبھی نہیں سوچنے بیٹھتے ہیں کہ ہمارے وقت کا روزانہ کتنا حصہ، کتنے گھنٹے اور منٹ اور سکنڈ محض بیکاری کی نذر ہوتے رہتے ہیں، دین و آخرت نہ سہی دنیا کے ہی کس کارآمد مشغلہ میں ان کا شمار ہو سکتا ہے؟ یہ شطرنج اور یہ تاش، یہ فلش اور برج، یہ کیرم اور پچیسی آخر کس حساب میں لکھے جائیں گے، یہ گھڑ دوڑ کے دیکھنے اور طرح طرح کی بازیوں میں عمر عزیز کی جتنی گھڑیاں بے دردی سے صرف ہو رہی ہیں، یہ زندگی کے کن مرحلوں کو طے کریں گی؟ اور یہ محض ہنسی اور تمسخر کی محفلیں، یہ سرگرم غیبتیں اور دل آزاریاں، یہ تہمتیں اور مبالغہ آرائیاں آخر کس کام آنے والی ہیں؟ اخلاق کو کہاں تک سنوارتی ہیں؟ ہر روز ہم میں سے ہر فرد کا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے، اور پھر ہر ہفتہ، ہر مہینہ، ہر سال اس کی میزان کہاں تک پہنچتی ہے؟ اور پھر عمر کے خاتمے پر کس قیامت کی حسرت اس وقت ہو گی جب یہ آج کے بے دردی سے ضائع کیے ہوئے وقت کے تودے اور پہاڑ برسوں اور سالہا سال کی شکل اختیار کیے ہوئے ملیں گے؟ بھگتنا بہر حال ہر شخص کا اپنا ذاتی حساب ہو گا، ورنہ قوم کی قوم، ملت کی ملت کے تضییع وقت کا حساب جوڑنے کوئی بیٹھے تو حساب لگے یا نہ لگے بہر حال سر تو چکرانے ہی لگے گا''

ایک جائزہ:

مولانا عبدالماجد دریابادی انبساطی کیفیت میں تھے۔ ابھی اپنے اس مضمون سے فارغ ہوئے اور حاضرین سے اجازت طلب کر کے اپنا ایک اور البیلا احتسابی مضمون سنانے لگے:

''آپ اگر امیر ہیں تو اپنی اشرفیوں اور اگر غریب ہیں تو اپنے پیسوں کو کس قدر عزیز رکھتے ہیں، ہر سکہ کو آپ صرف اسی وقت صرف کرنا چاہتے ہیں جب اس کے معاوضہ میں آپ کو کسی خاص لذت یا نفع کی امید ہوتی ہے لیکن خدا کی دی ہوئی اس بڑی نعمت اور فطرت کی بخشی ہوئی اس بڑی دولت کا بھی کبھی آپ نے حساب وکتاب رکھا ہے جس کا نام ''وقت'' ہے؟ آپ کو یہ معلوم ہے کہ آج جو کچھ آپ کر رہے ہیں سب ''وقت'' کے اندر ہو رہا ہے، پس اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو وقت ہی کے ہر جزئیہ، ہر ساعت، ہر منٹ، ہر لمحہ، ہر پل کا حساب دینا ہو گا۔ کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟

''کل'' یہ حساب کوئی دوسرا لے گا۔ ''آج'' آپ خود اپنا احتساب کیوں نہ کریں؟ سال کے تین سو ساٹھ دن، ہر دن کے چوبیس گھنٹے۔ آخر آپ کن مشاغل میں صرف کرتے ہیں؟ ان میں کتنا حصہ یادِ الٰہی کے لیے نکالتے ہیں؟ کتنا وقت نماز اور دیگر عبادات میں صرف کرتے ہیں؟ کتنی دیر خدمت خلق میں مصروف رہتے ہیں۔ کتنا وقت دردمندوں کی غم خواری اور بیکسوں کی دست گیری میں صرف کرتے ہیں؟ اور پھر کتنا وقت اپنی ذات وصفات کی پرورش، آرائش کی نذر کرتے ہیں؟ کیا ایسا بارہا نہیں ہوا کہ آپ نے سارا سارا دن دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں اور ساری ساری رات جلسوں اور تماشوں میں بسر کر دی ہے؟ کیا ایسا روزمرہ نہیں ہوتا کہ غیر ضروری لغویات کے پیچھے ضروری سے ضروری اور اہم سے اہم فرائض ترک ہوتے رہے ہیں، عمر کی جو گھڑیاں غیبت ونکتہ چینی، رشد وحسد، کذب ومبالغہ، فخر وغرور، خوشامد وسخن سازی،

نفس پرستی و عیش پسندی میں گذر رہے ہیں، کیا ان کی بابت بازپرس نہ ہوگی؟ پھر یہ کیا ہے کہ آپ دنیا کے دوسرے معاملات میں تو بڑے عاقل اور فرزانہ اور منتظم و دور اندیش سمجھے جاتے ہیں لیکن وقت کی دولت لٹانے میں آپ کی مسرفانہ فیاضیوں کی داستان اوراق لیل و نہار پر جلی حروف میں ثبت ہے"

کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں:

نئے اور پرانے سال کے ضمن میں یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ وہ لمحات آگئے، جن میں پرانے سال کو اپنی بساط لپیٹنی تھی اور ایک سالہ انسانی اعمال کا دفتر اپنے بغل میں دبائے اسے رخصت ہونا تھا۔ گھر میں نیا کیلنڈر بھی اب لگا دیا گیا، اس مرحلہ پر نئے اور پرانے سال کے درمیان رسمی ملاقات ہوئی۔ باہم گلے ملے، ایک خدمت سے سبکدوش ہوا، دوسرا برسر خدمت آیا، سبکدوش ہونے والے سال نے برسر خدمت آنے والے سال سے اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں کہا کہ جب آپ اپنے کام کا آغاز کریں، اس وقت میری جانب سے اقبال کا یہ پیغام نئے سال کے انسان کو پہنچا دینا:

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ان دریچوں سے جھانکتا ہے زوال:

دسمبر کی آخری تاریخ آگئی، گھڑی کی سوئی تیزی کے ساتھ بارہ بجے شب کی طرف بڑھ رہی ہے، اس کا کانٹا بارہ سے آگے کیا بڑھا کہ نوجوانوں کی ٹولیاں سڑکوں پر نکل کر شور و ہنگامہ میں مصروف ہو گئیں، گاڑیوں کے ہارن زور سے بجائے جانے لگے۔ فضا میں نغمہ بکھرنے لگا، رقص کا منظر سامنے آنے لگا، چپ و راست سے بے خبر مستی اور بے خودی کی کیفیت طاری ہے، اسی روز و شب میں الجھ کر اپنے دوسرے زمان و مکان سے غافل ہیں، اتنے میں ایک طرف سے آواز آنے لگی، آواز میں پختگی تھی، اس کی لوچ اور کشش نے مجھے بھی اپنی طرف متوجہ کیا، دیکھا تو ماہر القادری اپنے ماہرانہ انداز میں نئے سال کی نئی خوشی منانے والے مست و بے خود نوجوانوں سے بار بار کہہ رہے تھے:

رقص و نغمہ، شراب و عیش و نشاط
ان دریچوں سے جھانکتا ہے زوال

یک بامقصد جلسہ اور کارآمد باتیں:

ہواؤں کا رخ پر چلنے والے جوانوں کے مقابلے میں کچھ "کہنی نوجوان" (توحید پرست، حق پسند، ٹھوس اور بنیادی مقاصد اور تصور آخرت کے حامل نوجوان) بھی تھے، انہوں نے وقت اور نئے سال کے پس منظر میں موقع کی مناسبت سے ایک جلسہ کا اہتمام ۳۱ دسمبر کو سر شام حیدرآباد میں تھا۔ دعوت نامہ میرے نام بھی آیا تھا، میں جلسہ کے آغاز سے اختتام تک رہا۔ اس بامقصد اور کامیاب جلسہ میں جن بزرگوں کی باتوں کو میں نوٹ کر سکا، ان میں عمر فاروقؓ بھی ہیں، جنہوں نے فرمایا:

"میں اس بات کو بہت معیوب سمجھتا ہوں کہ تم میں سے کوئی لایعنی زندگی بسر کرے، نہ وہ دنیا
کے لیے کوئی عمل کرے نہ آخرت کے لیے"

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بات بھی میرے دل کو لگی کہ ''فرصت عمر نعمت مغتنم ہے، ضائع کوئی لمحہ نہ ہونا چاہیے، ساری عمر تحصیل کمال یا تکمیل ہی میں بسر ہونا چاہیے''

مولانا اعزاز علی امروہوی کی یہ دانشمندانہ بات بھی خوب تھی کہ ''جو زمانہ گزر چکا وہ ختم ہو چکا، اس کو یاد کرنا عبث ہے اور آئندہ زمانہ کی طرف امید کرنا بس امید ہی ہے، تمہارے اختیار میں تو وہی تھوڑا وقت ہے، جو اس وقت تم پر گزر رہا ہے، بس اس کی قدر کر لو''

اس کے بعد مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی مائک پر آکر یہ فرمانے لگے کہ ''بچپن گیا تو اب کہاں؟ جوانی ختم ہوئی تو بہار گئی، بڑھاپا آیا تو پیام موت لایا، غرض عمر عزیز بہت محدود شئے ہے، اس کی قدر و قیمت حسن استعمال پر موقوف ہے''

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)

1۔ اس شعر کی تشریح کیجیے۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

2۔ علامہ اقبال کی پوری نظم ''گورستان شاہی'' کو حاصل کیجیے جو اقبال کے مجموعہ کلام ''بانگ درا'' میں شامل ہے۔ اس نظم کو بہ آواز بلند پڑھیے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے کن خیالات کو پیش کیا ہے؟ اسے اپنے انداز میں لکھیے۔

3۔ نئے سال کی آمد پر آپ کس طرح خوشی کا اظہار کرتے ہیں؟ بیان کیجیے۔

3.3 متن (۲) مسلمانوں کا دور قیادت

مسلمانوں کی قائدانہ خصوصیات:

مسلمان میدان میں آئے، دنیا کی رہنمائی کی باگ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لی اور ان بیمار قوموں کو رہنمائی کے اس منصب سے معزول کیا جس پر وہ قابض ہو گئی تھیں اور جس کو انہوں نے کبھی صحیح طور پر استعمال نہیں کیا، مسلمانوں نے دنیا کے انسانوں کو اپنے ساتھ لے کر متوازن اور صحیح رفتار کے ساتھ صحیح منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا، ان میں وہ تمام صفات جمع تھیں، جو ان کو قوموں کی رہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی تھیں اور ان کی نگرانی اور قیادت میں قوموں کی فلاح و سعادت کی ضمانت کرتی تھیں، یہ امتیازی صفات حسبِ ذیل ہیں:

1۔ ان کے پاس آسمانی کتاب اور الٰہی شریعت تھی، اس لیے ان کو قیاس اور اپنی طرف سے قانون سازی کی ضرورت نہیں تھی، اور اس طرح وہ جہالت و ناواقفیت، روز روز کے قانون ردّ و بدل اور ترمیم، ہولناک غلطیوں اور مظالم سے محفوظ تھے، وہ اپنے سیاست و معاملات میں اندھا دھند چلنے اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور نہ تھے، ان کے پاس وحی اور شریعتِ الٰہی کی روشنی تھی، جس کے سہارے وہ چلتے تھے، اور جس سے زندگی کی تمام راہیں اور اس کے موڑ ان کے لیے روشن تھے، ان کا ہر قدم روشنی میں پڑتا تھا اور منزلِ مقصود ان کو صاف نظر آتی تھی:

''کیا وہ جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس میں جان ڈالی اور اس کو ایک روشنی عطا فرمائی جس کی مدد سے لوگوں میں چلتا پھرتا

ہے کیا وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں گھرا پڑا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتا'' (سورہ الانعام ۱۲۳)۔

ان کے پاس الٰہی قانون تھا، جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے تھے، وہ حق وانصاف کے علم بردار بنائے گئے تھے، اور ان کو سخت اشتعال و برہمی اور عداوت وبیزاری کی حالت میں بھی انصاف اور صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے اور نفس کا انتقام لینے کی اجازت نہیں دی گئی تھی:

''مسلمانو! خدا کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہر گز نہ چھوڑو، عدل کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو'' (سورۃ المائدہ ۸)۔

2۔ وہ حکومت اور قیادت کے منصب پر مستحکم اخلاقی تربیت اور مکمل تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئے تھے، انہوں نے دنیا کی عام حکمراں قوموں اور اہلِ حکومت کی طرح اپنے تمام اخلاقی عیوب و نقائص کے ساتھ پستی سے بلندی کی طرف جست نہیں لگائی تھی، بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحیٔ الٰہی ان کی اصلاح اور تربیت کرتی رہی تھی، اور سالہا سال وہ رسول اللہ ﷺ کی کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے تھے، آپؐ ان کا تزکیہ فرماتے رہے، ان کی مکمل تربیت فرمائی، زُہد وورع کی زندگی کا عادی بنایا، عفّت وامانت، ایثار وقربانی، خوف خدا کا اُن کو خوگر کیا، حکومت ومناصب کی حرص وطمع ان کے دل سے بالکل نکال دی، آپؐ کا ارشاد تھا کہ ''بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کریں گے جس نے اس کی فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے'' (روایت بخاری ومسلم)، ترفع، ذاتی سربلندی اور اعزاز کا شوق اور فتنہ وفساد کی خواہش سے ان کے دل بالکل صاف ہو گئے تھے، اُن کے کانوں میں رات دن قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑتے رہتے تھے:

''یہ آخرت کا گھر ہم اُن لوگوں کو عطا کریں گے جو دنیا میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد کے خواہاں نہیں اور انجام بخیر پرہیزگاروں ہی کا ہے'' (سورۃ القصص: ۸۳)۔

اس لیے وہ حکومت کے عہدوں اور منصوبوں پر پروانہ وار نہیں گرتے تھے، بلکہ وہ اس کے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے، اور اُن کی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہو جاتے تھے، اُن میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا، اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائے کہ وہ اپنا نام حکومت کے لیے پیش کریں، اپنے منھ سے تعریف کریں اور اپنی ذات کے لیے پروپگنڈا کریں، پھر جب وہ کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو اُس کو مالِ غنیمت یا لقمۂ تر نہ سمجھتے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے اور یقین رکھتے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے، وہ یہ آیت ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے:

''مسلمانوں! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کو پہونچا دو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے'' (سورۃ النساء ۵۸)۔ نیز یہ ارشاد: ''اور اسی نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے اور تم میں ایک کے ایک پر درجے بلند کیے تاکہ جو نعمتیں تم کو دی ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرے، بے شک تمہارا پروردگار جلد سزا دینے والا اور وہی بخشنے والا مہربان ہے'' (سورۃ الانعام ۱۶۶)۔

3۔ وہ کسی قوم کے خدمت گزار اور کسی نسل ووطن کے نمائندے نہ تھے، جن کے پیشِ نظر محض اس کی خوشحالی اور ترقی ہو اور جو اس کی

برتری اور تمام اقوام واطوان پر اس کی سیادت کے قائل ہوں اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ ان کی قوم تنہا حکومت کرنے کے لیے اور باقی تمام قومیں اس کی محکوم بننے کے لیے پیدا کی گئی ہیں، وہ عرب سے اس لیے نہیں نکلتے تھے کہ دنیا میں عربی شہنشاہی کی بنیاد ڈالیں اور اس کے زیر سایہ راحت و عشرت کی زندگی گزاریں اور اس کے زیر حمایت دوسروں پر فخر و تکبر کریں، نہ اس لیے کہ لوگوں کو رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی اور اپنی غلامی میں داخل کر لیں، وہ صرف اس لیے نکلے تھے کہ وہ بندگانِ الٰہی کو اپنے جیسے تمام بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کی بندگی میں داخل کریں، مسلمانوں کے سفیر ربعی بن عامرؓ نے یزدگرد شاہ ایران کے بھرے دربار میں اسی حقیقت کا اعلان کیا، انہوں نے کہا ''اللہ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگی سے رہائی دے کر اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم و ستم سے نجات دے کر اسلام کے عدل وانصاف میں لائیں'' (البدایہ والنہایہ، ابن کثیر) پس دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسان اُن کی نگاہ میں ایک حیثیت رکھتے تھے، اگر فرق تھا تو محض دین کا، رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر اُن کا پورا عمل تھا:

''انسانوں کی ابتداء آدم سے ہے اور آدمؑ کی خلقت مٹی سے، نہ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر فضیلت ہے نہ کسی غیر عرب کو عرب پر سوائے تقویٰ کے'' (حجۃ الوداع)۔

''اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے بنایا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے رکھے تاکہ آپس کی پہچان ہو، اللہ کے یہاں اسی کی عزت زیادہ ہے جو خدا ترسی اور تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے'' (سورۃ الحجرات ۱۳)۔

حاکمِ مصر عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک مصری کو ایک موقع پر کوڑا مارا اور اپنے باپ دادا پر فخر کیا، عمرؓ نے مصری کو ان سے بدلہ لینے کا حکم دیا اور عمرو بن العاص سے کہا ''تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں'' (تاریخ عمر بن الخطاب، ابن جوزی)۔

ان فاتحین اور حکمرانوں نے دین و علم و تہذیب کی بخشش میں کبھی بخل و تنگ دلی سے کام نہیں لیا، اور حکومت و اعزاز کے بارے میں کبھی وطنیت اور رنگ و نسب کا لحاظ نہیں کیا، وہ ایک ابر کرم تھے، جو تمام عالم پر محیط تھا اور اس کا فیض سب کے لیے عام تھا، جو سارے عالم کو سیراب کرتا گیا، اور زمین کے ہر حصّے نے اس کو دعائیں دیں اور مخلوقات نے اپنی اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے نفع اُٹھایا۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

ان لوگوں کے زیر سایہ اور زیر حکومت دنیا کی تمام قوموں کو بلا اختلاف رنگ و وطن، دین، علم، تہذیب اور حکومت میں اپنا پورا پورا حصہ لینے اور عربوں کے ساتھ دنیا کی تعمیر نو میں شریک ہونے کا پورا موقع ملا، بلکہ ان کے بہت سے افراد بہت سی فضیلتوں میں عربوں سے سبقت لے گئے، اور ان میں ایسے ائمہ، فقہاء اور محدثین پیدا ہوئے جو خود عربوں کے سرکا تاج اور مسلمانوں کا سرمایۂ فخر ہیں۔ ابن خلدون کے الفاظ ہیں: ''یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے حاملینِ علم میں باستثناء چند اکثر غیر عرب ہیں، کیا علومِ شرعیہ میں اور کیا علومِ عقلیہ میں، اور اگر ان میں سے کوئی عربی النسب ہے، تو وہ اپنی زبان، تربیت اور اساتذہ کے اعتبار سے عجمی ہے، باوجود اس کے کہ

4۔ انسان مجموعہ ہے جسم و روح، قلب، عقل و جوارح کا۔ انسان حقیقی سعادت اور فلاح اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا اور انسانیت کو متوازن ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کی یہ تمام قوتیں متناسب طور پر اس کے مرتبہ کے شایان شان نشو و نما اور پرورش نہ پائیں، دنیا میں صالح تمدن کا اس وقت تک وجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسا دینی، اخلاقی، عقلی، مادّی ماحول نہ قائم ہو جائے جس میں انسان کے لیے بسہولت تمام اپنے کمال انسانی کو پہنچنا ممکن ہو اور تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ زندگی کی رہنمائی اور تمدن کی جہاز رانی ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو، جو روحانیت و مادّیت دونوں کے قائل دینی و اخلاقی زندگی کا نمونہ کامل، عقل سلیم اور علم صحیح سے متصف ہوں، اگر ان کے عقیدے یا تربیت میں ذرا سا بھی رخنہ یا دھبّہ ہو گا تو وہ ان کے قائم کردہ تمدن میں بہت پھیل جائے گا، اور مختلف مظاہر اور صورتوں میں ظاہر ہو گا اگر کوئی ایسی جماعت غالب آگئی جو صرف مادّیت کی پرستار مادّی لذّتوں اور محسوس منفعتوں کی قائل اور معتقد ہے وہ اس زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی پر اعتقاد نہیں رکھتی اور حواس کے ماورا کسی اور حقیقت پر اس کا یقین نہیں تو اس کے مزاج اس کے اُصول اور میلانات کا اثر تمدن کی شکل و ساخت پر پڑنا ناگزیر ہے، وہ تمدن اُس کے مخصوص سانچہ میں ڈھل کر رہے گا، اور اس پر اس کی چھاپ ہمیشہ باقی رہے گی، اس کا نتیجہ ہو گا کہ انسانیت کے بہت سے خانے بھر جائیں گے اور بہت سے خانے خالی رہ جائیں گے، اس تمدن کی نمود صرف اینٹ، پتھروں، کاغذ، کپڑے اور لوہے اور سیسے میں ہو گی، جنگ کے میدان، عدالتیں، لہو و لعب کے مرکز اور عیش و عشرت کے حلقے اس کے مرکز ہوں گے اور وہاں وہ اپنی پوری بہار اور شباب پر ہو گا، باقی دل اور روح، لوگوں کے اخلاق، خانگی زندگی اور معاشرت، تعلقات باہمی اور معاملات اس کے حلقۂ اثر سے خارج ہوں گے، اور وہاں انسان حیوانات سے ممتاز نہ ہو گا، تمدن کی کیفیت اس جسم کی سی ہو گی جس میں غیر طبعی فربہی طاری ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ظاہری نگاہ میں بڑا شاندار اور پُر شکوہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اندرونی طور پر وہ بیسوں امراض اور تکالیف میں مبتلا ہوتا ہے، اس کا قلب ضعیف اور ماؤف ہوتا ہے، اور اس کی صحت نقطۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر ایسی جماعت غالب آجائے جو سرے سے مادّیت کے منکر یا اس کی طرف سے بے پرواہ اور صرف روحانیت اور مابعد الطبیعات حقائق کی قائل ہو اور اس کا رویہ زندگی کے بارے میں مخالفانہ اور معاندانہ ہو تو تمدن کا شاداب پھول کمھلا جائے گا، انسانی قوتیں اور فطری صلاحیتیں ٹھہر جائیں گی، اس قیادت کے اثر سے لوگ صحراؤں اور غاروں کی زندگی کو شہری زندگی اور تجرد کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں، خود آزادی اور جسمانی تعذیب مستحسن ہو جاتی ہے تاکہ جسم کا تسلط کمزور پڑ جائے اور روح پاک و بے آمیز ہو جائے۔ لوگ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں، تاکہ مادّیت کے پُر شور اور پُر تلاطم اقلیم سے نکل کر روحانیت کی پُر سکون اور پُر امن اقلیم میں پہونچ جائیں اور وہاں اپنی تکمیل کے مدارج حاصل کریں، اس لیے کہ ان کے عقیدے میں اس عالم مادّی میں انسان کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن پر عالم نزع طاری ہو جاتا ہے، شہر ویرانے بننے لگتے ہیں، اور زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے، چونکہ یہ اُصول و عقائد فطرتِ انسانی سے برسرِ جنگ ہیں، اس لیے فطرت ان کے خلاف رہ رہ کر بغاوت کرتی ہے، اور اس کا انتقام ایسی حیوانی مادّیت سے لیتی ہے، جس میں روحانیت و اخلاق کے ساتھ کوئی رواداری نہیں برتی جاتی، اس انقلاب میں انسانیت کی جگہ ایک چوپایانہ زندگی یا درندگی یا مسخ شدہ انسانیت برسرِ ظہور ہو جاتی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس رہبانی جماعت پر کوئی طاقت ور مادّی جماعت حملہ آور ہوتی ہے، اور پہلی جماعت اپنی فطری کمزوری کی وجہ

سے اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو کر حملہ آور جماعت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے، یا رہبانی جماعت خود امورِ دنیاوی کے انصرام میں مشکلات محسوس کر کے مادّیت اور اہلِ مادیت کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتی ہے، اور تمام سیاسی اُمور اُن کو سپرد کر کے خود عبادت اور مذہبی رسوم پر قانع ہو جاتی ہے اور دین و سیاست کی تفریق وجود میں آتی ہے، روحانیت و اخلاق روز بروز بے اثر اور عملی زندگی سے بے دخل ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ انسانی سوسائٹی ان کی گرفت سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے، زندگی خالص مادہ پرستانہ بن کر رہ جاتی ہے اور دین و اخلاق صرف ایک سایہ ہی سایہ بن کر یا ایک علمی نظریہ کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں، دنیا کی کمتر جماعتیں (جنہوں نے بنی نوع انسان کی قیادت و رہنمائی کی ہے) اس عیب سے خالی تھیں یا وہ مادہ پرست تھیں یا رہبانی، اس لیے انسانی تمدن اپنے اکثر عہد میں حیوانیت مادیت اور رہبانی روحانیت کے درمیان جھولا جھولتا رہا، اور انسانوں کی کشتی حیات دو انتہائی سروں کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی، کبھی مادّیت کا غلبہ ہو گیا اور کبھی روحانیت کا اعتدال و جامعیت بہت کم اس کو نصیب ہوئی۔

صحابہ کرامؓ کا امتیاز:

صحابہ کرامؓ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ دین و اخلاق اور قوت و سیاست کے مکمل پیکر تھے، اور ان کی منتشر صفات ان میں بیک وقت جمع تھیں، ان میں انسانیت کی اپنے تمام گوشوں، شعبوں اور محاسن کے ساتھ نمود تھی، اس اخلاقی اور اعلیٰ روحانی تربیت اس عجیب و غریب اعتدال (جو انسانوں میں کمتر دیکھنے میں آتا ہے) اس غیر معمولی جامعیت جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے، اور پھر مکمل مادی تیاری اور وسیع عقل کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ انسانی گرہوں کو ان کے اعلیٰ روحانی و اخلاقی و مادی مقصد و کمال تک پہنچا سکیں، چنانچہ ہم کو تاریخ میں خلافتِ راشدہ کے دور سے زیادہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب دور کا علم نہیں، اس دور میں روحانی و اخلاقی، دینی و علمی و روحانی وسائل و سامان انسانِ کامل اور صالح تمدن کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے، اس حکومت میں جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا، اور ایسی سیاسی و مادی قوت کے ساتھ جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی، اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے، اور اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظامِ حکومت کے لیے میزان کا درجہ رکھتی تھیں، تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق و فضیلت بھی اپنے پورے عروج پر تھی۔ فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی ترقی بھی جاری تھی، چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت، آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل و اسباب اور ترغیبات کے باوجود جرائم و بداخلاقیوں کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے، فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز طریقہ پر بہتر تھا، یہ ایک معیاری دور تھا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب نہیں دیکھ سکا اور اس سے زیادہ مبارک و پُر بہار زمانہ فرض نہیں کیا جا سکا۔

یہ نتیجہ تھا محض ان لوگوں کی سیرت کا جو حکومت کا کاروبار چلا رہے تھے، اور تمدن کے نگراں تھے، اور ان کے عقیدے، تربیت، طرزِ حکومت اور اُصول سیاست کا، اس لیے کہ وہ جہاں اور جس حال میں ہوتے دین و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے، وہ حکام کی حیثیت میں ہوتے یا معمولی کارکنوں کی، پولیس کی حیثیت میں ہوتے یا فوج کی، ہمیشہ محتاط و پاک دامن، دیانت دار، امانت شعار، خدا ترس اور منکسر مزاج پائے جاتے۔

ایک رومی سردار مسلمان فوجوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے "رات کو تم ان کو عبادت گزار پاؤ گے، اور دن کو روزہ دار، عہد وفا

کرتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں، اور آپس میں پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں''

دوسرے کے الفاظ ہیں ''وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں اور رات کو عبادت گزار، اپنے مفتوحہ علاقہ میں بھی وہ قیمت دے کر کھاتے ہیں، سلام کر کے داخل ہوتے ہیں، اور ایسا جم کر لڑتے ہیں کہ دشمن کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں''

ایک تیسرے شخص نے ان الفاظ میں تعریف کی ''رات کو دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ اُن کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں، اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں، اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے کہ گویا یہی کام ہے، بڑے تیر انداز، اور بڑے نیزہ باز، خدا کی یاد میں اس طرح مشغول و تر زباں کہ اُن کی مجلس میں کسی بات کا سننا مشکل ہوتا ہے''

اسی اخلاقی تربیت کا نتیجہ تھا کہ مدائن کی فتح میں کسریٰ کا مرصّع تاج اور اس کا فرشِ بہار جو لاکھوں اشرفیوں کی مالیت کا تھا، فوج کے ہاتھ لگتا ہے، لیکن کیا مجال کہ اس میں ذرا بھر تصرف کیا جائے، وہ قائد کے حوالے کر دیتے ہیں، اور قائد عمرؓ کو بھیج دیتے ہیں، وہ تعجب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس کو حوالے کر دیا اور حفاظت کے ساتھ پہنچایا ان کی امانت واقعی قابل تعریف ہے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)

1۔ اس مضمون میں مصنف مسلمان قائدین کی کون کون سی صفات کو بیان کرتے ہیں؟ تفصیل سے لکھیے۔

2۔ ابن خلدون کے بارے میں مطالعہ کیجیے اور اس پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

3۔ ''انسان مجموعہ ہے جسم و روح، قلب و عقل و جوارح کا'' اس کی تفہیم اپنے لفظوں میں کیجیے۔

3.4 خلاصہ (Summary)

اس اکائی میں دو متون کا مطالعہ کیا گیا۔ پہلا متن **''اے انسان! وقت کی قیمت پہچان''** وقت کی اہمیت اور اس کی درست قدر کرنے کی ضرورت پر مرکوز ہے۔ مولانا رضوان القاسمی کے اس متن میں شاعر اور ادیب کے انداز سے زندگی، وقت کی تیزی، اور ہر لمحے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اکبر الہ آبادی اور دیگر علماء کے اقوال اور مثالیں طلبہ کو سکھاتی ہیں کہ وقت ضائع نہ کریں اور اپنے اعمال کا احتساب کریں۔

دوسرا متن **''مسلمانوں کا دورِ قیادت''** مسلمانوں کی قائدانہ خصوصیات اور قیادت کی اصولی بنیادوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ مسلمانوں کی قیادت میں عدل و انصاف، اخلاقی تربیت، دین و علم کی بنیاد، اور قوم و ملت کے لیے فلاح و بہبود کو مقدم رکھا گیا۔ یہ متن واضح کرتا ہے کہ حقیقی ترقی اور صالح تمدن قیادت کی معیاری تربیت اور روحانی و اخلاقی اصولوں پر منحصر ہے۔

3.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہم نے درج ذیل صلاحیتیں حاصل کیں:

- متون کے مفہوم اور موضوعات کو سمجھنے کی صلاحیت۔
- متون میں استعمال شدہ اسلوب، ترکیبات، اور الفاظ کی شناخت۔

- وقت کی اہمیت اور اس کے درست استعمال کے بارے میں شعور۔
- اپنے روزمرہ کے اعمال اور وقت کے استعمال کا احتساب کرنے کی مہارت۔
- مسلمانوں کی قیادت کی خصوصیات اور اصولی بنیادوں کو سمجھنا۔
- قیادت میں عدل، اخلاق، اور علمی و روحانی تربیت کی اہمیت کا ادراک۔
- زبانی اور تحریری اظہار کے ذریعے خیالات پیش کرنے کی صلاحیت۔
- تمدن کی ترقی میں قیادت کے اثرات کو سمجھنا۔

3.6 فرہنگ (Glossary)

- متون :(Texts) لکھے ہوئے مواد یا ادب کے حصے۔
- موضوعات :(Themes) کسی متن میں پیش کیے گئے خیالات یا بنیادی نکات۔
- اسلوب :(Style) کسی متن یا تحریر کی مخصوص زبان اور بیان کی خصوصیت۔
- ترکیبات :(Expressions / Phrases) الفاظ یا جملوں کے مخصوص مجموعے اور ساخت۔
- الفاظ :(Vocabulary / Words) کسی زبان کے الفاظ اور ان کے استعمال کی صلاحیت۔
- وقت :(Time) زندگی کے اہم لمحات اور اس کے درست استعمال کا شعور۔
- احتساب :(Accountability / Self-assessment) اعمال، وقت یا کارکردگی کی جانچ اور تجزیہ۔
- قیادت :(Leadership) لوگوں یا قوم کی رہنمائی اور انتظام کا عمل۔
- عدل و اخلاق :(Justice and Ethics) صحیح فیصلے اور اخلاقی اصولوں کے مطابق عمل کرنا۔
- علمی و روحانی تربیت :(Intellectual & Spiritual Training) علم اور روحانیت کی ترقی اور پرورش۔
- زبانی و تحریری اظہار :(Oral & Written Expression) خیالات کو بول کر یا لکھ کر پیش کرنے کی صلاحیت۔
- تمدن :(Civilization) معاشرتی، علمی، اخلاقی اور مادّی ترقی کی مجموعی حالت۔

3.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Type Questions)

1۔ اسلوب کا مطلب کیا ہے؟

a) الفاظ کا مجموعہ
b) کسی متن کی مخصوص زبان اور بیان کی خصوصیت
c) خیالات کی ترتیب
d) وقت کی اہمیت

2۔ قیادت کے لیے کونسی خصوصیت سب سے اہم ہے؟

a) زہدوورع b) اخلاق اور عدل c) تزکیہ d) مابعدالطبیعات

3۔ احتساب کے متعلق درست بیان کیا ہے؟

a) صرف وقت کا حساب لگانا b) اعمال اور کارکردگی کی جانچ اور تجزیہ

c) قائدانہ صفات کا مطالعہ d) تمدن کی ترقی کی پیمائش

4۔ تمدن کا مفہوم کیا ہے؟

a) صرف معاشرتی ترقی b) صرف علمی ترقی

c) معاشرتی، علمی، اخلاقی اور مادّی ترقی کی مجموعی حالت d) صرف روحانی ترقی

5۔ زبانی و تحریری اظہار سے کیا مراد ہے؟

a) خیالات کو سمجھنا b) خیالات کو بول کر یا لکھ کر پیش کرنے کی صلاحیت

c) صرف تحریری اظہار d) صرف گفتاری اظہار

مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1۔ اسلوب اور تمثیلی اسلوب میں فرق بیان کریں۔

2۔ قیادت میں عدل وانصاف کی اہمیت کی وضاحت کریں۔

3۔ احتساب کی ضرورت اور اس کے فوائد بیان کریں۔

4۔ تمدن اور فلاح و بہبود میں تعلق کی وضاحت کریں۔

5۔ علمی و روحانی تربیت کے اثرات بیان کریں۔

طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1۔ وقت کے درست استعمال اور احتساب کی اہمیت پر تفصیلی مضمون لکھیں۔

2۔ مسلمانوں کی قیادت کی خصوصیات اور اصولی بنیادوں کو بیان کریں۔

3۔ تمدن کی ترقی میں قیادت کے اثرات اور مثالیں بیان کریں۔

4۔ زبانی اور تحریری اظہار کی اہمیت اور اس کے لیے ضروری مہارتیں وضاحت کریں۔

5۔ اخلاق، عدل، اور تزکیہ کی روشنی میں ایک اچھے رہنما کی خصوصیات بیان کریں۔

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد(Suggested Reading Materials)

1۔ ''بانگ درا''از علامہ اقبال

2۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر''، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام۔ لکھنؤ۔2001

3۔ ''تلاش ہند''۔جواہر لعل نہرو

4۔ ''تذکرہ''از مولانا آزاد۔ساہتیہ اکیڈیمی۔یوپی۔

اکائی 4۔ بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا (حصہ چہارم)

(Engaging with Narrative and Descriptive Accounts Part-4)*

اکائی کے اجزاء

4.0 تمہید (Introduction)

4.1 مقاصد (Objectives)

4.2 متن (۱): ملفوظات (Sayings/Discourses)

4.3 متن (۲): روزنامچہ (Diary/Journal)

4.4 متن (۳): سفر نامہ (Travelogue)

4.5 خلاصہ (Summary)

4.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

4.7 فرہنگ (Glossary)

4.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

4.0 تمہید (Introduction)

پچھلی تین اکائیوں میں آپ نے مختلف قسم کے متون کا مطالعہ کیا ہے۔ ان مطالعات کے ذریعے آپ نے حصولِ معلومات کے علاوہ اظہارِ بیان کے مختلف طرز کو پہچانا ہے۔ اس اکائی میں ادب کی تین اہم اصناف کے بارے میں آپ کو واقف کرایا جارہا ہے۔ اور یہ تینوں اصناف اپنی اپنی مسلمہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس اکائی میں دیئے گئے متون ڈاکٹر مجید بیدار کی تصنیف ''دکنی تذکرے'' سے لیے گئے ہیں۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ

- ادب کی تین اہم اصناف 'ملفوظات' روزنامچہ اور سفر ناموں کی ہیئت اور دیگر تفصیلات سے واقف ہو سکیں۔
- اردو میں رائج دیگر نثری اصناف سے ان کا تقابل کر سکیں۔

* Prof. Najmus Saher, Professor, Centre for Distance and Online Education, MANUU

- اپنے طور پر ان اصناف کو تحریر کر سکیں۔

4.2 متن(۱)ملفوظات

بزرگوں کے اقوال اور ان کے کلام کو محفوظ کرنے کا طریقہ قدیم زمانے سے رائج ہے۔ ہر دور میں بزرگانِ دین اور عقیدت مندوں کی کمی نہیں رہی۔ خدا کے نیک اور بزرگ بندے حالتِ وجد یا مراقبہ کی حالت میں جو الفاظ کہہ دیتے ہیں انہیں عقیدت مند لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ یہ طریقہ قدیم زمانے سے رائج رہا اور اس قسم کی تحریروں کو اردو زبان میں ملفوظات کا نام دیا جاتا ہے۔ اردو نثر کی یہ ایک ایسی تحریری خصوصیت ہے جس میں اولیائے کرام کے فقرے اور جملے اکٹھا کر کے محفوظ حالت میں رکھے جاتے ہیں اور جس کی عظمت کے سامنے ہمارے سر احترام سے جھک جاتے ہیں۔

ملفوظ کا لفظ عربی زبان سے اردو میں مروج ہوا جو صیغۂ واحد میں مستعمل ہے۔ اس لفظ کی جمع ملفوظات کے لفظ سے کی جاتی ہے جس کے معنی ایسی کتاب جس میں بزرگوں کی کیفیت لکھی گئی ہو کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر ملفوظات کا لفظ بزرگوں کا کلام' حدیث بزرگان اور اولیاء اللہ کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مستعمل ہے۔ لغوی اعتبار سے ملفوظات ایسی تحریروں کو کہا جائے گا جس میں بزرگ ترین انسانوں کے فقرے اور جملے تحریری طور پر قلمبند کیے گئے ہوں، یعنی خدا کے وہ بزرگ ترین بندے جو عبادت و ریاضت کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہر وقت خدا کی یاد میں مصروف رہتے ہوں اور ان کی زبان سے کسی خاص موقع پر زندگی اور زندگی کی حیثیت کے بارے میں فقرات ادا ہوں تو ان کے عقیدت مندوں نے انہیں جوں کا توں تحریری شکل دے دی۔ اس انداز کو اردو میں ملفوظات نگاری کہا جاتا ہے۔

فنی اعتبار سے ملفوظات ایسے فقروں کو کہا جاتا ہے جو نہ صرف زندگی کے واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ اس دور کی زبان و بیان کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اردو کے ابتدائی مخطوطات کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اولیاء اور صوفیاء نے اپنے بیانیہ جملوں سے نہ صرف خدا پرستی اختیار کی بلکہ انسانوں کے دلوں پر بھی حکمرانی کی، اردو میں ابتدائی طور پر ملفوظات کی طویل فہرست ملتی ہے اور یہ سلسلہ ۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک قائم رہتا ہے۔ سید برہان الدین عالم شاہ، سید محمد راجو قتال، نظام الدین اولیاء سلطان قطب الدین اور سلطان سکندر کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو ادب میں ابتدائی طور پر ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا۔ جو رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے کتبہ کی شکل اختیار کرتا گیا۔ اردو ملفوظات کی زبان پر پنجابی، سرائیکی، گجراتی، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات بہت واضح ہیں۔ اردو ادب کی ابتداء میں بزرگانِ دین کے ملفوظات کے علاوہ کوئی اور واضح ثبوت نہیں ملتا کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس دور میں اردو ترقی پا رہی تھی، یعنی قدیم دور کے ملفوظات ہی سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ زبان کی ترقی کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اردو ملفوظات کی تفصیل کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''جب ہم شاہ وجہی الدین علوی گجراتی ۱۵۰۴ء تا ۱۵۸۹ء کے ملفوظات فقروں اور فارسی عبارت میں استعمال کیے جانے والے اردو زبان کے الفاظ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زبان زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا اور ان کے شاگرد و مرید سارے گجرات میں پھیلے ہوئے

تھے۔ان کے مریدوں نے ''بحر الحقائق'' کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں سوال
فارسی میں اور ان کے جواب جو شاہ وجہی الدین نے دیئے ہیں اردو میں ہیں۔''

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی تک ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا۔اردو زبان کی ابتداء میں فارسی تحریروں کے درمیان اردو کے چیدہ چیدہ جملے اور فقرے چست کیے ہوئے نظر آتے ہیں جنہیں ملفوظات کا درجہ حاصل ہے۔عام طور پر ملفوظات سے مراد ایسے فقرے اور جملے لیے جائیں گے جو اردو کے ابتداء کے وقت فارسی تصانیف اور تحریروں میں بیان کیے گئے اردو الفاظ کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس اعتبار سے ملفوظات ایسی تحریریں قرار پاتی ہیں جن میں ایک نئی زبان کا عکس پایا جائے۔اگر فارسی کتاب میں جو قدیم ہو اردو کے جملے مستعمل ہوں اور ان کی حیثیت علمی وادبی اعتبار سے معیاری ہو تو انہیں ملفوظات کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

فنی اعتبار سے ملفوظات مذہبی تحریروں میں فقرے چست کرنے اور بزرگان دین کے اقوال زرین اکٹھا کرنے کے مفہوم سے وابستہ ہیں۔ ملفوظات بیان کرنے والا انہیں ترتیب نہیں دیتا بلکہ اس کے لواحقین اور اس سے وابستگی رکھنے والے اسے ترتیب دیتے ہیں۔اس فنی تعریف کے پس منظر میں ملفوظات ایسی تحریریں قرار پاتی ہیں جو کسی بزرگ کی زبان سے ادا ہوتی ہیں اور عقیدت مندوں کے قلم سے تحریری شکل پاتی ہیں۔در حقیقت ملفوظات نگاری ایک تحریری شکل ہے جو خاص انداز اور خداپرستی کے جذبہ سے وابستہ ہوتی ہے جن کے ذریعہ انسان اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔

ملفوظات نگاری کو ادب میں طرز تحریر کی شکل حاصل ہے۔اسے صنفِ ادب کا مقام نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس میں ادبی ضروریات کی پوری طرح نمائندگی ہوتی ہے کیونکہ ان کی حیثیت جملوں اور فقروں کی شکل میں چیدہ چیدہ کتابوں میں بکھری ہوتی ہے۔اسی لیے ان کا ادبی مرتبہ متعین کرنا قطعی ناممکن ہے۔البتہ یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ملفوظات خالص اخلاقی اور مذہبی اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ملفوظات کے ذریعے خدا سے محبت کے جذبے کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔یہ طرز تحریر صرف جملوں کی حد تک محدود ہوتی ہے جس سے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ قدیم دور میں زبان و بیان کی تراش و خراش کس نہج پر تھی۔اسی وجہ سے ادب میں ملفوظات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ترقی یافتہ قوموں میں ملفوظات قوموں کے مزاج اور ان کے آباواجداد کے رہن سہن کے علاوہ ان کے اصول زندگی کو پہچاننے میں فیصلے کا حق رکھتے ہیں۔اردو ادب میں ملفوظات کے مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس زبان کی ابتداء میں صوفیا اور علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحقیق کے میدان میں جہاں حوالہ جات اور تحقیقی نوادرات کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔اس مرحلے پر تحقیق کے لیے ملفوظات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ محققین کے نزدیک ملفوظات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

اردو میں ملفوظات نگاری کا عہد نویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک جاری رہا۔جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان اپنی نورسیدہ زمانے میں علماء، صوفیا اور اولیاء کرام کے دامن میں پلتی رہی اور ان ملفوظات کی وجہ سے اردو زبان کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔جس سے تحقیق کے لیے اردو زبان وادب کے آغاز وابتداء کے بارے میں قیمتی مواد ستیاب ہوتا ہے۔

ملفوظات در حقیقت پیرِ طریقت کی زندگی کا جزو ہوتے ہیں، جن کی تاریخی حیثیت اور ان کے وجود کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے علم الدین سالک نے اپنے مضمون ''آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو'' میں تحریر کیا ہے۔

''صوفیاء جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ اسلام کی سادگی، اخوت اور مساوات بھی لائے وہ جہاں بھی گئے ان کی صحبت میں ہندو، مسلمان اور اچھوت برابر حاضر ہوتے رہتے ان میں سے اکثر کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ دن میں ایک وقت ایسا آتا جب ایک عام مجلس منعقد ہوتی جس میں ہر شخص مذہب و ملت کے اختلاف کے باوجود شریک ہو سکتا تھا۔ یہاں زندگی کے اکثر پہلوؤں پر گفتگو ہوتی۔ کبھی کبھی حالات اور معاشرہ بھی زیرِ بحث آجاتا۔ پیرِ طریقت ان موضوعات پر بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرنا اس کے بعض مرید جو تقرب کا درجہ رکھتے اشارات لکھتے جاتے، گھر جا کر انہیں مرتب کرتے اور پھر جب جماعت خانے (خانقاہ) میں اپنے مرشد کے حضور میں باریابی حاصل کرتے تو اپنے لکھے ہوئے ملفوظات اپنے مرشد کو سناتے۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ تم نے میرے مفہوم کو صحیح صحیح بیان کر دیا ہے تو اس کے دوسرے مرید اس کی نقول حاصل کر لیتے۔ اس طرح یہ حلقۂ خاص سے نکل کر عوام تک پہنچ جاتے۔ ملفوظات میں جہاں ایک صاحب سجادہ کے روز مرہ کے مشاغل کا ذکر ملتا ہے وہاں اس وقت کی سیاست، معاشرت اور لوگوں کی اقتصادی حالت کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سب سے زیادہ بیش بہا معلومات ہمیں فقط ان ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ان کو پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فاتح کشور کشا اور شہنشاہ بھی اکثر مشکلات اور پریشانیوں کے وقت ان ہی بوریا نشینوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔''

ملفوظات کوئی منظم اور اصولی طور پر سوانحی خصوصیات نہیں رکھتے۔ لیکن انہیں بھی تذکرے کی ایک قسم اور سوانح کی ترتیب میں اہم مواد تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف قدیم تاریخ کا پتہ چلتا ہے بلکہ قدیم مجلسوں کی تاریخ بھی ملفوظات سے مدون کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملفوظات کسی بھی ادب کے آغاز اور قوم کے ابتدائی اصول کی نمائندگی کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں جس طرح ایک تذکرہ میں کسی شخصیت کے مشاغل اور اس کی زندگی کے علاوہ کارناموں کا ذکر کیا جاتا اسی طرح ملفوظات میں پیرِ طریقت کی زندگی کے چند اہم واقعات اور مریدین سے ان کے تعلقات تبلیغی طریقوں اور اسلامی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ملفوظات تاریخی نوادرات کی حیثیت رکھنے کے باوجود بھی ادبی طور پر تذکرہ سے رشتہ جوڑے ہوتے ہیں جس میں سوانحی انداز کا جز مختصر طور پر پایا جاتا ہے۔

تذکرے کے انداز اور نقوش ملفوظات میں ذیلی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ملفوظات پیر طریقت کا مختصر تجرباتی تذکرہ ہوتا ہے جس میں پیرِ طریقت کی زندگی سے زیادہ عام لوگوں سے اس کے روابط سے بحث کی جاتی ہے یعنی ملفوظات در حقیقت آہنی تعلقات کو اجاگر کرنے والا ایک تذکرہ ہے۔ اس خصوص میں محمد اجمل خاں ''ملفوظات آزاد'' کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں۔

''ملفوظات سے نہ صرف اس تاریخی دور کی سماجی و سیاسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں کیا کیا خیالات اور سوالات ابھرتے ہیں اور ان کا

پس منظر کیا تھا۔''

ملفوظات نہ صرف بنیادی طور پر انسان سے انسان کے درمیان تعلقات کا عمل ہے بلکہ ایک عظیم آدمی افہام و تفہیم کے لیے جو انداز اختیار کرتا ہے اس کے بارے میں بھی ملفوظات کے ذریعہ ہی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس اعتبار سے ملفوظات کو آپسی روابط کا تذکرہ کہا جاسکتا ہے۔ عالمی ادبیات میں ملفوظات کے وجود اور اس پر تحریر کردہ کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے ''ملفوظاتِ آزاد'' کے دیباچہ میں محمد اجمل خاں تحریر کرتے ہیں کہ

> ''ملفوظات کے سلسلے میں بیسیوں کتابیں فارسی اور اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہیں یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں مختلف لوگ کتابت یا روایت کرتے تھے، جیسے کاتب الواقدی یا حماد الراویہ کی روایات اسی طرح فارسی اور اردو میں مختلف اقوام و حکایات کو سن کر نقل کرنے کا نام ملفوظات پڑ گیا۔ ان ملفوظات کی صحت زیادہ تر ناقل کی ثقاہت پر مبنی ہوتی ہے۔۔۔۔ ملفوظات کی بہت سی قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ اب تک عموماً تصوف و مذہب کے سلسلے میں ملفوظات لکھے گئے ہیں۔''

ملفوظات کے لیے انگریزی لفظ Gospels استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر Gospels انجیل کے تحریر کرنے والے چار افراد کی تحریر کی نمائندگی کرتا ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کو Mathew کے علاوہ Mark' Luke اور Johan نے تحریر کیے جو انجیل کی شکل میں ظاہر ہوئے چونکہ ان اشخاص نے زبانی تحریر کے طریقہ کو عقیدت مندی کے طور پر کتابی شکل دی۔ اسی لیے اردو لفظ ملفوظات کا متبادل Gospels ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اردو ملفوظات میں بھی مرشد سے عقیدت کا رجحان نمایاں ہوتا ہے۔

Gospels کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ Evangelium کا انگریزی ترجمہ ہے۔ Gospels کا لفظ قدیم انگریزی میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ جو Gospels کی ترکیب کا نمائندہ God بہ معنی خدا اور Spel بہ معنی Story یا کہانی کے لیے جائیں گے۔ اس طرح Godspel کو مخفف کر کے Gospel لفظ کو رواج دیا گیا۔ جس کے معنی خدا کی کہانی کے ہوتے ہیں۔ لیکن دورِ جدید میں روحانی اور مذہبی شخصیات کے ارشادات کو تحریر کرنا Gospels کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ملفوظات ایک تحریری روایت ہے جس کے ذریعہ تاریخ اور سوانح کا مواد جمع کرنے کے لیے قدیم نوادرات کا ثبوت ملتا ہے۔ ملفوظات کو ادبی حیثیت نہیں دی جاسکتی لیکن ادبی متن کی تحقیق میں ملفوظات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ جس مقام پر تاریخ اور قدیم روایات ثبوت فراہم کرنے کے معاملہ میں دم توڑ دیتے ہیں۔ وہاں ملفوظات اپنی خصوصیات کی وجہ سے تاریخی اور سوانحی مواد کے لیے عینی گواہ کا قرض ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اور ادب میں ملفوظات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ملفوظات کے متبادل لفظ Gospels کی فنی اور ادبی تعریف کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں تحریر کیا گیا ہے:

The oral Gospel was not preached in order to give historical or even biographical information neither did the Gospel literature as the final built of

early Christian preaching come into existence in the interests of history in the modern scientific (objective) science of that word. The tradition behind the Gospel was sustained at every stage for the sake of preaching and edification, with apologetic and theological modification. The gospels and the tradition behind them had a religious purpose. Nonetheless, there some material of historical value in them. Not only do they attest the fact that Jesus was truly a historical, but also they include several historical "blocks" that are not entirely dissolved by theological interpretation. The passion narrative, for example and many of the sayings and parables (especially these that show series unique escha to logical consciousness.) Thus, the venture of writing a life of Jesus" remains a legitimate task for the historian.

But for understanding of the character of the Gospel it is important to recognize that even such historical data were handed down only as they served there logical purposes and not for their own sake. This doesn't suggest that the essence of the gospels is spiritual information or "external truth" as opposed to history. Rather it is announcement that revelation has come as the Jesus of history. The Gospels present this historical revelation in its truemeanin, i.e. history in its real, theological demantion, history and theology.

Johan's Gospel always presents the material with its own peculiar interpretation, adding discourse from traditions that have no parallel in syneptic Gospelsڈ

انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے Gospels یا ملفوظات کو عقیدت مندانہ نثر قرار دیا ہے اور اس کے ذریعہ ایسے مواد کی تشریح کا امکان ظاہر کیا ہے جس کے ذریعہ تاریخی اقدار کی وضاحت ممکن ہے۔ ملفوظات کی مثال دیتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ یہ در حقیقت اقوال زرین کا درجہ رکھتے ہیں جو حکایتی انداز سے بھی رونما ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ملفوظات ایسی تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں تاریخی تغیر کو بیان کرتے ہوئے اخلاقی، دینی اور مذہبی اقوال کو کسی اہم شخصیت کی زبان سے ادائیگی کے وقت تحریری شکل میں محفوظ

کر لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ملفوظات پیر طریقت کے ارشادات و اقوال کا بیش بہا مجموعہ کہلائے گا۔ جس میں اس دور کی مذہبی، سیاسی اور سماجی تغیر کا عکس ملتا ہے جس کی وجہ سے کسی زبان اور مذہب سے تعلق اور اس کی قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)

1۔ ملفوظات سے کیا مراد ہے؟

2۔ ملفوظات کی فنی حیثیت پر نوٹ لکھیئے۔

3۔ اپنی پسند کے کسی ایک صوفی/ولی پر ملفوظ تحریر کیجیے۔

4۔ مصنف کی رائے میں ملفوظات نگاری کو کیوں صنف ادب کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔

4.3 متن (۲) روزنامچہ

انگریزی زبان میں روزنامچہ کے لیے Diary کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ ڈائری اپنی بنیاد کے اعتبار سے لاطینی زبان کے Diarium سے استفادہ کرتا ہے۔ لاطینی زبان میں Diarium کے معنی Day یا دن کے ہوتے ہیں۔ Diarium کا لفظ تصرف میں لایا جا کر Dies میں تبدیل ہوا اور پھر وہ اپنی ہیئت بدلتے ہوئے Day کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لفظ Day سے انگریزی میں ڈائری Diary کا رواج ہوا جو در حقیقت لاطینی لفظ Diarium کا مترادف ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان میں Diary کا لفظ روزنامچہ کے لیے موزوں اور متبادل قرار دیا جا سکتا ہے۔ فنی طور پر ڈائری کے اسلوب اور اس کے انداز و تشکیل کی تعریف کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے روزنامچہ کے بارے میں لکھا ہے:

"A Daily record of events kept by a diarist it describes matters coming under the writer's observation, including those gleaved ..... contemporary reports correspondence and conversation with his personal comments. Not all daily record kept by an individual are diaries in the generally accepted sense of terms connoting those which have biographical, historical or literary value. The word journal is often used synomymously. The Sir Walter Scotts Journals is diary. The ancient Greeks kept diaries (ephemerides).

"روزنامچہ نویسی" کی نئی تعریف کرتے ہوئے اس بیان میں انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے بتایا ہے کہ روزنامچہ سے مراد اندراجات ہیں، جن میں روزانہ معاملات کا ذکر کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ روزنامچہ نویس اپنی تحریر سے اندراجات کرتے ہوئے روزانہ تحریر کرنے کے فن کو ظاہر کرتا ہے، یعنی روزنامچہ ایسی تحریری خصوصیت قرار پائے گی جس میں بذات خود اپنے حالات اور تجربات ہر روز کی روشنی میں قلمبند کیے جائیں۔ در حقیقت روزنامچہ نویسی ذاتی مشاہدات کا آئینہ دار ہے، جس کے ذریعہ مصنف اپنے روزانہ کے

حالات لکھتااور بیانیہ انداز کے ذریعہ روز کے معاملات کی روشنی میں خود کی زندگی کا عکس پیش کرتا ہے۔

روزنامچہ کی تشریح کرتے ہوئے اس بیان میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایسا طرز اسلوب ہے جس کے ذریعہ دستاویزی خصوصیت تکمیل پاتی ہے، یعنی روزنامچہ نویس کی تحریروں سے مخصوص دور کے حالات کے پس منظر میں زندگی رواں دواں دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈائری در حقیقت چند اندراجات' خانگی معاملات' انفرادی خصوصیات اور باہمی گفتگو کے علاوہ خط و کتابت اور مراسلت سے مربوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شمار شخصی حالات و معاملات کی عکاسی کی وجہ سے سوانح عمری میں کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ روزنامچہ شخصی سوانح عمری کی حیثیت رکھتا ہے۔

روزنامچہ کو اُردو کی قدیم طرز تحریر ''تذکرہ'' سے اس لیے مربوط کیا جاتا ہے کہ اردو زبان میں جدید صنف سوانح نگاری کی تشکیل تذکرہ گوئی سے ہوئی۔ اس کے علاوہ روزنامچہ میں ایک انسان کی شخصیت کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے، جس میں خود نوشت سوانح کی خصوصیت اور فن سوانح نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ نویسی اردو تذکرہ نگاری سے قریب' سوانح نگاری سے ازلی رشتہ اور خود نوشت سوانح سے پوری طرح استفادہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے روزنامچہ' سوانح' تذکرہ اور خود نوشت سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

روزنامچہ نویسی کے دوران سیاسی' سماجی اور ادبی اقدار کی پیشکشی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی اور معاشرتی معاملات کی جھلکیاں بھی مبسوط حیثیت میں روزنامچہ کے ذریعہ اکٹھا کی جاتی ہیں۔ شخصی واردات اور منفرد ذہنیت کی عکاسی بھی روزنامچہ کے ذریعہ ممکن ہے۔ ایک اعتبار سے روزنامچہ سوانحی' تاریخی اور ادبی اقدار کا حامل ہوتا ہے جس میں شعوری طور پر ذاتی حالات قلمبند کرنے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اگرچہ روزنامچہ نویسی ایک مکمل صنف کی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن اس طرز کے ذریعہ شخصی انفرادیت اور ذاتی صلاحیت کے علاوہ اہم خدمات اور خصوصیات کا ذکر روزانہ کی تاریخ کے پس منظر میں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں روزنامچہ نویسی کو بنیاد بنا کر خود نوشت سوانح عمریاں لکھی جارہی ہیں۔

روزنامچہ نویسی کے ذریعہ شخصیت اور کارناموں کی تحقیق اور مواد کی فراہمی کا عمل تکمیل پاسکتا ہے۔ زندگی کے حقائق' اصلیت کے روپ میں نمایاں ہوسکتے ہیں، یعنی اگر کوئی محقق کسی شخصیت کی سوانح اور خدمات کی پیش کشی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے لیے موضوع اور مواد کی فراہمی میں روزنامچہ کا اسلوب اپنا حق ادا کرسکتا ہے۔ ان بنیادی خصوصیات کی وجہ سے روزنامچہ کو ایک اسلوب کے درجے کے علاوہ شخصیت اور کارناموں کی تحقیقی تشکیل میں معاون بننے والی بہترین طرز اظہار کی حیثیت دی جاتی ہے۔ روزنامچہ' اردو نثر کی ایک قیمتی طرزِ تحریر ہے جس سے تشکیل انسانیت کے علاوہ خدمات اور اس کا عکس واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ روزنامچہ کے فن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے:

> ''ڈائری یا روزنامچہ ادب کا ایک شعبہ ہے۔ بعض روزنامچے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ اٹلی اور انگلستان میں بعض نامور ادیبوں نے اپنے روزنامچہ لکھے۔ ان روزنامچوں سے نہ صرف لکھنے والے کے سوانح معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کے دور پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم ایک پورے دور کو ایک شخصیت کے روزنامچہ میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے بڑے مقبول ہوئے۔ یہ روزنامچے اولاً رسالہ ''درویش'' دہلی اور اس کے بعد رسالہ ''منادی'' دہلی میں شائع ہوتے رہے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو روزنامچے اشاعت کی غرض سے تحریر میں لائے جاتے ہیں ان میں

ایک پہلو نمائش کا ہو سکتا ہے۔ اور دوسرا افشائے حقیقت کا۔ یعنی لکھنے والا جس رنگ میں اپنے کو پیش کرنا چاہے۔ روزنامچہ کی بہترین صورت وہ ہے، جب لکھنے والا اپنی یادداشت سے یا روزنامچہ لکھے نہ کہ اشاعت کی غرض سے۔ خود نوشت سوانح نگاری میں روزنامچہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے کہ روزنامچہ میں مصنف کے شب و روز کا ذکر خود اس کے قلم سے ہوتا ہے۔ روزنامچہ کی ایک خالص ادبی صورت بھی ہے۔''

شخصیت اور شخصیت کا تعلق عہد سے اور پھر زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ روزنامچہ کے ذریعہ تکمیل پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ جزئیات اور پرکاری میں بعض اوقات خود نوشت سوانح سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ انسان کے روزانہ حرکات اور مشاہدات کا ذکر صرف روزنامچہ کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور اسی فن کو بنیاد بنا کر سوانح ترتیب دی جاسکتی ہے۔ در حقیقت روزنامچہ ایک ایسی طرز تحریر ہے جس میں جذبات، تاثرات اور مشاہدات کے علاوہ عام حالات کے تغیر کا جائزہ بھی ممکن ہے۔ اس لیے روزنامچہ ذاتی تجربات، شخصی کارنامے اور سیاسی، معاشی اقتصادی تبدیلیوں کا ایک ایسا اظہار ہے جس کے ذریعہ انسان کی شخصیت کے مختلف دنیاوی معاملات سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ علی روزنامچہ کی خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روزنامچہ نگاری میں بھی اسی قدر تنوع پایا جاتا ہے جس قدر کہ فطرتِ انسانی میں کسی ناول یا افسانے کے انجام کی طرح اس کی دلچسپی بھی سب سے زیادہ مستقبل سے ناآگہی میں مضمر ہوتی ہے جو مصنف کے ذہنی عمل اور رد عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی لیے روزنامچہ نگاری کے لیے کسی نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ ادبیت کے اظہار کی، لیکن ایک چیز جس پر زور دینا ضروری ہے وہ ایجاز و اختصار ہے۔ طوالت، لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے لیے درد سر کا باعث بن جاتی ہے اور اظہارِ مطلب کے لیے بھی طوالت غیر ضروری بلکہ مضر ہے''

روزنامچہ کی تحریر کے لیے اختصار کو ضرورت قرار دیتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ روزنامچہ نویسی ایک بہترین طرز تحریر ہے۔ لیکن اس فن کو طوالت کی وجہ سے نقصان پہنچتا ہے۔ اگر روزنامچہ مختصر اور جامع ہو تو اس کی ادبی حیثیت دو بالا ہو جائے گی۔ روزنامچہ نگار کو ناول اور افسانہ نگار کی طرح اپنی روزانہ مصروفیات کو ادبی انداز کے علاوہ تجسس آمیز اسلوب سے نوازنا پڑتا ہے تاکہ پڑھنے والوں کی دلچسپی آغاز سے اختتام تک برقرار رہے۔ ایک بہترین روزنامچہ کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مختصر وقت میں پڑھا جاسکے اور ساتھ ہی ادبی طور پر اس میں محویت کو اس طرح مدغم کیا جائے کہ جس کے بعد روزنامچہ، افسانوی خصوصیت اور ناولانہ صلاحیت کا علمبردار ہو جائے۔

روزنامچہ نگاری میں ذاتی تاثرات کو زبان و بیان کی چاشنی سے مربوط کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ اسی وقت کامیابی کے زینے طے کر سکتا ہے جبکہ اس کے تحریر کرنے کا انداز منفرد حیثیت کا حامل ہو اور اس کی تحریر میں لچک اور جاذبیت ہو۔ عام طور پر مبہم اسلوب اور غیر معیاری طرز و انداز سے فن کو اجاگر کرنے والا مصنف روزنامچہ کے ذریعہ منظر عام پر نہیں آسکتا، کیونکہ اس کی تحریر جاذب نظر نہیں ہوتی۔ روزنامچہ کے لیے تحریر کی دل کشی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی روزنامچہ کے ذریعہ نہ صرف ایک فرد اپنی زندگی کے واقعات قلمبند کرتا ہے بلکہ اپنے معاصرین سے تعلقات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے روزنامچہ نگاری میں ایک عہد کے واقعات و حالات کی تاریخ کو شخصیت کے پس منظر میں یکجا کیا جاسکتا ہے اور اس خصوصیت کی بنا پر روزنامچہ ایک انفرادی طرز تحریر کا غماز ہو جاتا ہے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check Your Progress)

1۔ انگریزی میں روزنامچہ کے لیے کون سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا کیا مفہوم ہے؟

2۔ آپ پانچ دن تک روزنامچہ میں اپنی روزمرہ مصروفیات کو قلمبند کیجیے۔

3۔ روزنامچہ اور آپ بیتی میں کیا فرق پایا جاتا ہے۔

4.4 متن(۳)سفر نامہ

انسان کی زندگی کئی حالات اور واقعات سے مربوط ہوتی ہے۔ زندگی کو گزارنے کے لیے وہ مختلف نشیب و فراز سے گزرتا اور خوش حالی بدحالی کا سامنا کرتا ہوا اس دنیا میں اپنی بود و باش کو آگے بڑھاتا ہے۔ زندگی کا ایک عجیب و غریب لمحہ نقل مقام کرنے سے معنون ہے، یعنی ہر انسان کو زندگی کے کسی حصّے میں بھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اسی دوران سفر کے حالات کو تحریری شکل دے کر نثر میں پیش کرنا ''سفر نامہ'' کہلاتا ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے وہ حالات جو سفر میں بیت جائیں ان کا تذکرہ کرنا ''سفر نامہ'' کی تعریف میں شامل ہے۔ سفر نامہ کا ربط فنی طور پر تذکرہ سے قریب اور سوانح سے بالکل منسلک ہے۔ اسی لیے سفر نامہ کو تذکرہ نگاری کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے۔

اردو کے نثری اسلوب میں ''سفر نامہ'' ایک خاص انداز اور طرز نگارش کا نمائندہ ہے۔ اس فن کے ذریعہ انسان اپنے حالات سفر بیان کرتا اور مشکلات و مصائب کا ذکر کرتے ہوئے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سفر نامہ فنی طور پر ''خود نوشت سوانح'' سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ سفر نامہ کوئی علیحدہ صنف نثر نہیں بلکہ یہ مرکب طرز تحریر کا درجہ رکھتا ہے، جس کے ذریعہ انسان کے حالات سفر سے واقفیت ہوتی ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ ایک طرز نگارش کے علاوہ کوئی اور ادبی حیثیت نہیں رکھتا گرچہ ادبی طور پر سفر نامہ تحریر کرنے کا رواج قدیم زمانے سے رہا لیکن اسے مکمل صنف ادب کی حیثیت نہیں دی گئی۔ کیونکہ یہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی نمائندگی کرتا ہے۔

''سفر نامہ'' کا لفظ عربی سے اردو میں مروج ہوا جو دو الفاظ سے مرکب ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے۔ عربی زبان میں سفر کا لفظ مسافرت یا وطن سے باہر جانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور عربی لفظ نامہ کے معنی لکھا ہوا خط یا چھٹی کے ہوتے ہیں۔ اس ترکیب سے سفر نامہ کی حیثیت لکھی ہوئی مسافرت یا سفر کے دوران لکھا ہوا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ معنوی اعتبار سے سفر نامہ سے مراد ایسی طرزِ تحریر لی جائے گی جس میں کوئی انسان وطن سے باہر سفر کر کے اس سفر کے حالات تحریری طور پر قلمبند کرے۔ اس اعتبار سے سفر نامہ ایک ایسا طرز اسلوب قرار پاتا ہے جس کے ذریعہ حالات سفر کو طرز نگارش کی زینت دینے کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ اس طرزِ تحریر کے ذریعہ سفر کے دوران پیش آنے والے حیرت انگیز اور عجیب و غریب حالات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے، اسی لیے یہ طرزِ تحریر فنی طور پر دلچسپ اور محویت کو برقرار رکھنے والی سمجھی جاتی ہے۔

اردو نثر میں سفر نامہ کا فن قدیم دور ہی سے رائج رہا۔ بسا اوقات سفر نامہ داستانوی انداز پر بھی لکھے گئے۔ ان داستانوی سفر ناموں میں حیرت و استعجاب اور دلچسپی کے تمام سامان میسر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامے ہر ادب میں اپنی حیثیت اور مقبولیت رکھتے ہیں۔ اردو میں

''سندھ بادجہازی''کا سفر نامہ داستانوی عناصر کو پیش کرنے کے باوجود بھی اپنی مقبولیت کو دوبالا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سفر نامہ کا انداز تفریحی اور حصول معلومات کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک، ایک ملک سے دوسرے ملک تک اور ایک تاریخی شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرنا اور ان مقامات کے حالات قلمبند کرنا قارئین کے لیے معلومات میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ اسی لیے سفر نامہ ثقافتی تعلقات ہموار کرنے کا ذریعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس سے نہ صرف تلاش و جستجو کا اظہار ہوتا ہے بلکہ نئی دنیا کی دریافت اور سفر کے دوران انسانی تجربات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ دنیا کے ادبیات میں سفر نامے تجسس ذہنیت کے علمبردار ہیں۔ ایک انسان کا اپنے وطن سے نکل کر جنگلوں میں مارے مارے پھرنا دریاؤں اور سمندروں میں طوفان کے مقابلے کرنا، طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک انسان میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ سفر کرے اور نئی نئی جگہیں دریافت کرے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check Your Progress)

1۔ سفر نامہ کی فنی خصوصیات کو بیان کیجیے۔

2۔ سفر ناموں کے مطالعہ سے ہمیں کیا فائدے ملتے ہیں؟

3۔ کوئی دو مشہور سفر ناموں کا مطالعہ کیجیے اور ان پر ایک نوٹ لکھیے۔

4.5 خلاصہ(Summary)

اس اکائی میں ہم نے ادب کی تین نثری اصناف — ملفوظات(Sayings / Gospels)، روزنامچہ / (Diary Journal)اور سفر نامہ — (Travelogue) کا مطالعہ کیا۔ ملفوظات میں بزرگانِ دین کے اقوال، حکمت بھرے فقروں اور عوامی روایات کا تاریخی مواد محفوظ ہوتا ہے اور اس کا ادبی و تاریخی حوالہ اہمیت رکھتا ہے۔ روزنامچہ ذاتی مشاہدات، روزمرہ کے اندراجات اور دور کے سماجی، سیاسی یا ادبی مناظر کا زندہ عکس پیش کرتا ہے۔ سفر نامہ سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات، ثقافتی مشاہدات اور مقامات کی تفصیل کا بیان ہوتا ہے جو معلوماتی اور تفریحی دونوں مقاصد پورے کرتا ہے۔ اس اکائی کا مقصد طلبہ کو ان اصناف کی شناخت، ان کے سماجی و تاریخی پس منظر، اور خود لکھنے کی صلاحیت سے روشناس کروانا ہے۔

4.6 اکتسابی نتائج(Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہم نے سیکھا کہ

- ملفوظات، روزنامچہ اور سفر نامہ کی ہیئت اور بنیادی خصوصیات کیا ہیں۔
- ان اصناف کو اردو کے دیگر نثری انداز سے موازنہ اور تمیز کر سکتے ہیں۔
- ملفوظات کے ذریعے تاریخی و مذہبی حوالہ جات اور عوامی سوچ کا سراغ ملتا ہے۔
- روزنامچہ ذاتی مشاہدات کو روزانہ اندراجات کی صورت میں دستاویزی انداز سے کیسے پیش کرتا ہے۔

- سفر نامہ سفر کے تجربات، مقامی ثقافت اور تاریخی معلومات کو دلچسپ انداز میں کیسے ذخیرہ کرتا ہے۔
- خود اپنے ملفوظ، مختصر روزنامچہ یا مختصر سفر نامہ تحریر کر سکتے ہیں۔
- ان اصناف کے ادبی، تاریخی اور تحقیقی استعمالات کو سمجھتے ہیں (مثلاً تحقیق میں حوالہ، سوانح نگاری میں مواد وغیرہ)۔

4.7 فرہنگ (Glossary)

- **ملفوظات (Gospels / Sayings):** بزرگانِ دین یا اولیاء کے اقوال و حکایات کا مجموعہ؛ عقیدت مندوں کی طرف سے قلمبند شدہ کلمات۔
- **روزنامچہ (Diary / Journal):** روزانہ اندراجات پر مبنی تحریر، مصنف کے ذاتی مشاہدات اور حالات کی عکاسی۔
- **سفر نامہ (Travelogue):** کسی سفر کے دوران دیکھے گئے مناظر، واقعات اور تجربات کا بیانیہ۔
- **تذکرہ (Tazkira / Memoir-like account):** شخصیات یا مجالس کا مختصر ذکر؛ تاریخ یا سوانح کے لیے ماخذ۔
- **سوانح (Biography):** کسی شخصیت کی زندگی، کارنامے اور حالات کا منظم بیان۔
- **خودنوشت (Autobiography):** زندگی کے واقعات کا مصنف خود اپنے قلم سے بیان۔
- **اندراج (Entry):** روزنامچہ یا لاگ میں مخصوص دن/واقعے کا تحریری اندراج۔
- **طرزِ تحریر (Mode / Style of Composition):** کسی صنف کی مخصوص بیانیہ کشش، ساخت اور زبان۔

4.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Type Qusetions)

1۔ ملفوظات عام طور پر کس طرح کی تحریر ہوتی ہے؟

a) ذاتی سوانحِ عمری
b) بزرگانِ دین کے اقوال کا مجموعہ
c) سفر کی دستاویزات
d) ناول

2۔ روزنامچہ کا سب سے خاص وصف کون سا ہے؟

a) طویل تحقیقی حوالہ جات
b) روزانہ کی ذاتی اندراجات (daily entries)
c) تاریخی افسانہ گوئی
d) منظوم کلام

3۔ سفر نامہ کس کے لیے سب سے زیادہ مفید ہوتا ہے؟

a) صرف شاعروں کے لیے
b) ثقافتی اور جغرافیائی معلومات حاصل کرنے والوں کے لیے
c) لسانی قواعد سیکھنے والوں کے لیے
d) صرف مذہبی افراد کے لیے

4۔ ملفوظات کو اردو ادب میں کون سی صنف کے ساتھ قریب مانا جاتا ہے؟

a) افسانہ b) ڈرامہ c) تذکرہ/سوانح d) شعری مجموعہ

5۔ روزنامچہ نگاری میں جو صلاحیت خاص طور پر درکار ہے وہ کیا ہے؟

a) غزلیہ اندازِ بیان b) ایجاز اور اختصار (conciseness)

c) طویل مباحثی بحث d) محاوراتی لغت

مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1۔ ملفوظات اور روزنامچہ میں بنیادی فرق مختصراً لکھیں۔

2۔ سفر نامہ لکھتے وقت کون سی چیزیں قارئین کے لیے دلچسپی پیدا کرتی ہیں؟ تین نکات لکھیں۔

3۔ روزنامچہ کو تحقیق میں کس طرح ماخذ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے؟ ایک مثال دیں۔

4۔ ملفوظات کے ادبی یا تاریخی فوائد کیا ہیں؟ دو نکات لکھیں۔

5۔ ایک مختصر جملے میں بتائیں: اچھے سفر نامہ نگار کی کون سی صفت لازمی ہے؟

طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1۔ ملفوظات کی فنی، تاریخی اور تحقیقی اہمیت پر تفصیلی مضمون لکھیں۔ مثلاً: مصدر و ضبط، مرحلہ ارتقاء، اور تحقیقی اعتبار

2۔ روزنامچہ نگاری: تعریف، خصوصیات اور روزنامچہ کو سوانح نگاری میں ماخذ بنانے کے طریقے بیان کریں۔)حوالہ جات، اندراجات کی نوعیت، اشاعت کے مسائل(

3۔ سفر نامہ کی ساخت اور اس کے ادبی فوائد پر طویل نوٹ لکھیں؛ ساتھ میں دو مشہور اردو سفر ناموں کا تجزیہ کریں۔

4۔ موازنۂ مقالہ : ملفوظات، روزنامچہ اور سفر نامہ میں سے کسی دو اصناف کا موازنہ کیجیے — مقاصد، اندازِ بیان اور تحقیقی قدر کے اعتبار سے۔

5۔ عملی سوال : ایک مختصر ملفوظ (6–8 جملے) یا روزنامچہ کا تین دن کا اندراج یا دو پیراگراف کا سفر نامہ خود تحریر کر کے پیش کریں (امتحان میں عملی تخلیق کا موقع دیا جائے)۔

4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

1۔ ''دکنی تذکرے'' ڈاکٹر مجید بیدار۔ مکتبہ شاداب، اورنگ آباد

اکائی 5۔ معروف مضامین پر مبنی وضاحتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا (حصہ اول)

(Engaging with Popular Subject Based Expository Writing Part-1)*

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید (Introduction)

5.1 مقاصد (Objectives)

5.2 متن (1) مولانا ابوالکلام آزاد

5.3 متن (2) کھیل کود اور تعلیم

5.4 متن (3) سلسلۂ روز و شب

5.5 متن (4) Coorg

5.6 متن (5) A Truly Beautiful Mind

5.7 خلاصہ (Summary)

5.8 فرہنگ (Glossary)

5.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

5.0 تمہید (Introduction)

پچھلی اکائی میں آپ نے نویں تا بارھویں اور اعلیٰ سطح کی اردو نیز انگریزی کی نصابی کتب سے اخذ کردہ پانچ متون کا مطالعہ کیا اور ان کے مفہوم پر مختلف طریقوں سے اظہار خیال کیا۔ اس اکائی میں مزید پانچ متون دیے جا رہے ہیں۔ ان متون کے انتخاب میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ متون زیر تربیت معلمین کی دلچسپی کے موضوعات پر مبنی ہوں۔ لہٰذا پہلا متن عظیم شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح پر مبنی ہے۔ دوسرا متن ہندوستان کی ایک بے لوث خاتون فاطمہ بی پر ہے۔ بقیہ تین متون اسکولی نصاب سے لیے گئے ہیں۔ ان متون کا بغور مطالعہ کیجیے اور ان پر اظہار خیال کیجیے۔

* Prof. Najmus Saher, Professor, Centre for Distance and Online Education, MANUU

5.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کی تکمیل کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ

- ادب کے مطالعے سے ادبی ذوق کو پروان چڑھا سکیں۔
- مختلف موضوعات کو پڑھنے کے بعد اس پر اظہار خیال کر سکیں۔
- دیے گئے متون کے معنی و مفاہیم اور معلومات کو اپنے طور پر پیش کر سکیں۔
- دیے گئے متون کا خلاصہ تحریری اور زبانی پیش کر سکیں۔
- دیے گئے متون کا تنقیدی جائزہ لے سکیں۔

5.2 متن(1) مولانا ابوالکلام آزاد

درج ذیل عبارت ڈاکٹر نجم السحر کے مضمون ''ابوالکلام آزاد-ایک ہمہ جہت شخصیت'' سے ماخوذ ہے۔

ابوالکلام آزاد-ایک ہمہ جہت شخصیت

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ 11؍نومبر مولانا آزاد کا یوم پیدائش ہے جسے حکومت آندھرا پردیش نے ''یوم تعلیم'' کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔ مولانا آزاد جو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے اور گیارہ برس تک اس عہدے پر فائز رہے۔ آج ان کی عظیم شخصیت پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ابوالکلام 11؍نومبر 1888ء ذوالحجہ 1305ھ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ والد نے ان کا تاریخی نام ''فیروز بخت'' رکھا تھا اور اس طرح اس مصرع سے استخراج کیا۔

جواں بخت و جواں طالع و جواں باد

مولانا کے سوانحی تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تین بہنیں اور ایک بھائی تھے جن میں سب سے بڑی بہن کا انتقال کمسنی میں ہی ہو گیا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر والد نے دی۔ بعد میں مختلف اساتذہ جیسے مولانا محمد یعقوب دہلوی، محمد ابراہیم، شمس العلماء مولانا سعادت حسین وغیرہ سے مختلف علوم کی نصابی کتابیں پڑھیں۔ پندرہ برس کی عمر میں درس نظامی سے فارغ ہو چکے تھے۔ کھیل کود کا نہ شوق تھا اور نہ اس کے لیے فرصت تھی۔ ذہن کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ اپنے ہم درسوں سے آگے رہتے تھے۔ تعلیم کی مہینوں کی منزلیں دنوں میں طئے کیں۔

شاعری: شاعری کا شوق مولانا کو دس گیارہ برس کی عمر سے ہی پیدا ہو گیا۔ ان کی پہلی غزل بمبئی سے نکلنے والے گلدستہ ''ارمغان فرخ'' جنوری ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ اپنا تخلص ''آزاد'' رکھا۔ پہلے امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے بعد میں شوق نیموی کے شاگرد ہوئے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہے۔

خطابت: مولانا میں خطابت کی فطری صلاحیت موجود تھی۔ اور یہ وصف انہیں توارث میں ملا تھا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں یہ عالم تھا کہ دو دو

گھنٹے بہ آسانی تقریر کر سکتے تھے۔ 1904ء میں لاہور میں انجمن حمایت الاسلام کے جلسہ میں برجستہ تقریر کی تو ان کی سحر بیانی کے چرچے سارے پنجاب میں عام ہو گئے۔

صحافت: مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز 1899ء میں ''نیرنگ عالم'' کی اشاعت سے ہوتا ہے۔ 1900ء میں دوسرا ہفت روزہ اخبار ''المصباح'' جاری کیا جو مصر کے اخبار ''المصباح الشرق'' کی تقلید میں تھا۔

''مولانا آزاد نے اپنے ہفتہ وار ''الہلال'' سے مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا انداز خطاب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ الہلال مسلمانوں کے کسی بھی مکتب خیال سے اتفاق نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا''۔

سیاست: مولانا آزاد نے سیاست کا پہلا سبق 1907ء کے لگ بھگ بنگال کے ان سیاسی لیڈروں سے سیکھا تھا جو وطن کی آزادی کے لیے خفیہ انقلابی تحریکیں چلایا کرتے تھے۔

1930ء میں جب نمک ستیہ گرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا دوبارہ ایک سال سے زائد عرصہ کے لیے قید میں رکھے گئے۔

1939ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ 8؍اگست 1942ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' کا ریزولیوشن منظور ہوا۔ اس کے دوسرے دن مولانا آزاد دوسرے کانگریسی رہنماؤں جواہر لعل نہرو، آصف علی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، آچاریہ کرپلانی' کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے۔ انہیں پہلے احمد نگر جیل پھر بانکوڑہ جیل میں رکھا گیا۔ 15؍جون 1945ء کو رہا ہوئے۔

کانگریس کے صدر کی حیثیت سے سات سال مسلسل خدمات انجام دینے کے بعد 1946ء کے صدارتی انتخاب میں صدارت سے سبکدوش ہو گئے۔ بیشتر کانگریسی اراکین چاہتے تھے کہ مولانا دوبارہ صدارت کے عہدہ پر فائز رہیں لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ اور جواہر لعل نہرو کا نام پیش کیا اور متفقہ طور پر پنڈت نہرو کو کانگریس کا صدر منظور کر لیا گیا۔

وزارت: 15؍اگست 1947ء کو ہندوستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوا۔ گاندھی جی کی خواہش اور اصرار پر مولانا نے اپنے لیے وزارت عظمیٰ کے بجائے وزیر تعلیم کا عہدہ پسند کیا۔ ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے قوم کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں اور آخر تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد 15؍جنوری 1947ء تا 22؍فروری 1958ء یعنی کم و بیش گیارہ برس وزیر تعلیم کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے انہوں نے اپنے تعلیمی نظام کو کامیاب بنانے کی غرض سے اپنی وزارت کے سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر تاراچند' پروفیسر ہمایوں کبیر اور خواجہ غلام السیدین کی خدمات حاصل کیں۔ انہوں نے تعلیم کے تقاضوں کو سمجھا اور تعلیم کو جمہوری بنانے کئی ایک اقدامات کیے۔ اسکول جانے والے تمام بچوں کو بنیادی تعلیم مفت اور لازمی قرار دیا۔ عوام میں ناخواندگی کی شرح گھٹانے اور خواندگی کو عام کرنے کی کئی اسکیمات روبہ عمل لائی گئیں۔ بنیادی تعلیم کے اساتذہ کے لیے ٹریننگ کالجس کھولے گئے۔

گو کہ 22؍فروری 1958ء کو اس چشمۂ فیض اور ہمارے درمیان موت کی دیوار کھڑی ہو گئی لیکن ان کی زندہ جاوید تصانیف ہمارے درمیان ہیں جن سے نسلاً در نسلاً استفادہ کیا جا سکتا ہے۔!!

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)
1۔ مولانا آزاد کے ادبی کارناموں کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
2۔ مولانا آزاد کی صحافت کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

5.3 متن(2) کھیل کود اور تعلیم

درج ذیل متن جناب محمد اسحاق کے مضمون ''کھیل کود اور تعلیم''، مشمولہ ''تعلیم ایک تحریک۔ایک چیلنج'' سے لیا گیا ہے۔

''جب سے بچہ محلّے کے بچوں کی صحبت میں پڑا ہے بگڑ گیا ہے۔اب اس کا جی پڑھنے میں نہیں لگتا۔جب سے کھیل کا چسکا لگا ہے نہ اس کو بھوک لگتی ہے اور نہ دھوپ چھاؤں کا خیال رہتا ہے بس صبح سے شام تک باہر رہنے لگا ہے۔'' ماں باپ کی یہ شکایتیں آپ آئے دن سنتے ہی ہوں گے ایسی شکایتیں کرتے وقت ماں باپ خود اپنے بچپن کا زمانہ بھول جاتے ہیں اور انہیں اپنی شرارتیں یاد نہیں آتیں۔اگر آپ کا بچہ کھیلتا کودتا ہے اور بچوں کے ساتھ گھل مل گیا ہے تو سمجھئے آپ خوش قسمت ہیں اور اگر کھیل کود سے دور الگ آپ کا بچہ کسی گوشہ میں خاموش بیٹھا رہتا ہے تو یہ آپ کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے۔کیونکہ یہ مسائلی بچہ (Problem Child) ہوگا جو آئندہ آپ کے لیے بہت پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔

ہر بچپن کھیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ہر بچہ کھیلتا ہے۔جو بچے کھیلتے نہیں وہ بچے نہیں۔ کھیل کے دوران ان کی ذاتی صلاحیت، جوش، جذبہ، جدت ساری باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ان کی حقیقی مسرت کا سرچشمہ یہی کھیل ہی تو ہے۔ کھیل کا صلہ خود کھیل ہے۔اگر کسی بچہ کی شخصیت جاننا چاہتے ہو تو دیکھو کھیل کے میدان میں اس کا برتاؤ کیسا ہے وہ کہاں تک کھیل کے قواعد اور اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔کب ضد اور زبردستی پر آجاتا ہے اور کن بہانوں سے جھگڑے نکالتا ہے۔ یا ناراض ہو کر میدان چھوڑ جاتا ہے۔ یا پھر سب باتیں برداشت کر کے اپنی پوزیشن پر ڈٹا رہتا ہے۔ کس حد تک کیپٹن کی ہدایات پر عمل کرتا ہے اور مخالف کو شکست دے کر کیسے خوشی میں ناچتا ہے اور خود ہارنے کے بعد اپنی شکست کو برداشت کرتا ہے یا گالیوں پر اتر آتا ہے۔

کسی نے یہ بات سچ کہی ہے کہ Sportsman Sprit ''کھلاڑی کی آن'' دیکھنا ہو تو وہ کھیل میں ہارنے کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کس خندہ پیشانی سے اپنی شکست تسلیم کرتا ہے۔ کھیل کی نیرنگیاں ایسی ہیں کہ کبھی جیتنا ہوتا ہے تو اکثر ہارنا پڑتا ہے۔

ہم میں اکثر ایسے ہیں کہ جنہوں نے صرف جیتنا ہی سیکھا ہے ہارنا نہیں سیکھا۔ ''کھلاڑی کی آن'' ایسی صفت ہے جو زندگی میں بڑے کام کی چیز ہے۔کیوں کہ ساری زندگی جیت اور ہار، کامیابی و ناکامی، امید و بیم حسرت و یاس کے ایک طویل سلسلہ کا نام ہے۔

پروفیسر کارل گروس کی رائے ہے کہ وہ بچے کھیلنے میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں جن کہ والدین ان کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں۔ مرغی کا بچہ انڈے کے خول سے باہر آتے ہی دانہ چگنے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے جس ذی حیات کی زندگی آئندہ چل کر جس قدر مخلوط، پیچیدہ اور ذمہ دارانہ ہوگی اتنی ہی اس کے بچپن کی مدت طویل ہوگی یہی وجہ ہے کہ انسان کا بچہ برسوں کھیلتا رہتا ہے۔پروفیسر میگڈوگل کا خیال ہے کہ بچوں میں رشک و رقابت کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کھیلتے ہیں کھیل کی جان یہی مسابقت اور مقابلہ ہے۔

کھیل کی خصوصیات:

کھیل ایک جبلی فعل ہے۔ ہر بچہ مختلف آزادانہ حرکات کرتا ہے، کودنا، پھاندنا، چیخنا، چلانا ہنسنا اور شور مچانا، گہری سانس لینا اور بے تحاشہ زبان چلانا، لڑنا، جھگڑنا، گالی گلوچ کرنا، اپنی ٹیم کے وقار کا خیال رکھنا یہ سب کچھ آپ کھیل کے دوران دیکھ سکیں گے۔ کھیل میں جذبہ، جوش اور دلچسپی کے علاوہ یہ ذہنی، جسمانی، حسی اور حرکی عمل بھی ہے۔ کھیل میں مشاہدہ توجہ، تصور، قوت فیصلہ، استدلال وغیرہ سب بیک وقت استعمال ہوتے ہیں۔ فٹبال کے کھیلاڑی کو آن واحد میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ فٹبال کو کس زاویہ سے ٹھوکر لگائے اور گول بنائے۔ کھیل خود مقصد ہے اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں کھیل آپ اپنا انعام ہے۔ جو خوشی اور مسرت کھیل سے حاصل ہوتی ہے وہی اس کا حاصل ہے۔ انسانی فطرت کا اظہار بے روک ٹوک کھیل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ کھیل میں توجہ اور دلچسپی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کھیل کے دوران ماں کی پکار اور اسکول کی گھنٹی کی آواز بچوں کے کانوں میں نہیں آتی۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی (غالب)

کھیل اور تعلیم:

بچوں کو صحت مند توانا اور تندرست رہنے کے لیے کھیلنا ضروری ہے کھیل ذہنی اور عقلی تربیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ دماغی محنت کے بعد تکان محسوس ہوتی ہے۔ کھیل کے بعد وہ پھر تازہ دم ہو جاتا ہے۔

کھیل سماجی تربیت کا اہم ذریعہ ہے۔ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تنہا رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ باہمی رشک ور قابت کے ساتھ ساتھ باہمی تعاون اور امداد کے فوائد سے وہ واقف ہوتا جاتا ہے۔ وہ ہمہ تن اپنی ٹیم اور اپنے اسکول کی خاطر جانبازی سے کوشش کرتا ہے۔ دوسروں کے خیالات وجذبات جس کا دوران کھیل آزادانہ اظہار ہوتا ہے اس سے واقف ہوتا جاتا ہے۔ اس کے خیالات میں مختلف تجربات کی بدولت درستگی، صحت اور صفائی آجاتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے جو اس کی آئندہ زندگی کا قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اداروں کی ملازمتوں میں اسپورٹس مین کا انتخاب ضرور کیا جاتا ہے۔

موثر اور کارآمد تعلیم وہی ہے جو کھیل کی اسپرٹ میں دی جائے جہاں پر مقصد کا اظہار نہ ہو بلکہ صرف ذریعہ رہ جائے۔ اسکول ایک جمہوری ادارہ ہے۔ طلبہ کو غیر محسوس طریقہ پر یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ خود دریافت کرنے کی مسرت سے مستفید ہوں اور انہیں اپنی خودی اور شخصیت کے اظہار کے مواقع ملیں۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)

1۔ بچوں کے لیے کھیل کود کیوں ضروری ہے؟

2۔ بچوں کی صحت اور کھیل میں کیا رشتہ پایا جاتا ہے؟

_____

_____

5.4 متن(3)سلسلہ روز وشب

آج کل کہا جاتا ہے کہ بچے کی ذہنی نشوونما پر اس کی پیدائش سے پہلے ہی ماحول اور ماں کے خیالات کا اثر پڑنا شروع ہو جاتا ہے، یہ بات کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ تو ماہرین نفسیات ہی بتا سکتے ہیں لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ مجھے اتنا ضرور بتاتا ہے کہ بچہ، ماں باپ کی خاص طور پر ماں کی شخصیت اور خیالات کا اثر اس تربیت سے بھی زیادہ قبول کرتا ہے جو وہ اسے دیتے یا دینا چاہتے ہیں اور اس کے نقوش اتنے گہرے اور پائیدار ہوتے ہیں جس کے اچھے یا برے نتائج سے زندگی بھر وہ دوچار ہوتا رہتا ہے۔ ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت'' میں یہی معنی پنہاں ہو سکتے ہیں کہ وہ ماں ہی ہے جو بچے کی زندگی بناتی ہے۔

میری زندگی پر سب سے گہرا اثر کس شخصیت کا پڑا؟ اس سوال کا میرا ذہن پہلا اور بے اختیار جواب یہ دیتا ہے کہ یہ ہستی میری مشتاق فاطمہ مرحومہ کی ہے۔ یوں تو عام طور پر ہر انسان اور ہر فن کار خصوصاً اپنی ماں سے متاثر ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عام طور پر شریف انسان اپنی ماں کو بہت اونچا درجہ دیتا ہے لیکن میں جب اپنی والدہ کے بارے میں جذباتی تعلق سے قطع نظر کر کے بھی سوچتی ہوں تو بھی وہ ایک بلند اور غیر معمولی شخصیت کے روپ میں نظر آتی ہیں۔ جب وہ چار سال کی تھیں اس وقت ان کی والدہ فوت ہو گئیں تھیں اور والد صوفی منش آدمی تھے جن کو گھر، بال بچوں سے کچھ زیادہ تعلق نہ تھا، اس لیے ان کی تمام تربیت اور نگرانی دادا دادی نے کی اور اسی طرح قدرت نے انہیں اس لاثانی انسان کی تربیت سے فیضیاب ہونے کا موقع دیا۔ جس کو دنیا خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے نام سے جانتی ہے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتی ہوں کہ ان کی پوتی میں وہ ساری بنیادی خوبیاں موجود تھیں جنہوں نے حالی کی شخصیت کو بے مثال بنا دیا ہے۔ وہ اپنے گھرانے کی پہلی پڑھی لکھی لڑکی تھیں جس کی تعلیم میں مولانا حالیؔ نے خود دلچسپی لی تھی۔ اگرچہ آج کل کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں سے ان کا کیا مقابلہ لیکن اگر علم کا مقصد اخلاقی قدروں کو پرکھ کر ان کو روح کی گہرائیوں میں اتار لینا ہے، اگر اس سے انسان کی ذاتی صفات اجاگر ہوتی ہیں، اگر اس کی بدولت انسان درد دل کی نعمت سے فیضیاب ہو سکتا ہے اور خدمت، ایثار، صبر اور محبت کے بیش بہا اور کم یاب جواہر سے اس کی جھولی بھر جاتی ہے یا بھر سکتی ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ میری والدہ نے اپنے بہت محدود علم سے لامحدود فائدے حاصل کیے تھے۔ وہ اپنی اولاد کی تربیت، نگرانی اور اخلاقی تعلیم میں بھی ہمیشہ یہ چیزیں پیش نظر رکھتی تھیں کہ وہ دنیاوی کامیابی، دولت، شہرت پا سکیں یا نہیں مگر اچھے، سچے، باخدا انسان ضرور بنیں۔ خوش قسمتی سے ان کو شوہر بھی وہ ملا جو خاندان بھر کا ہیرا کہا جاتا تھا اور جس کی شرافت اور نیکی ہی کا نہیں، قابلیت ذہانت اور قومی خدمات کا بھی دور دور شہرہ تھا۔ میرے والد خواجہ غلام الثقلین اور ان کی بیوی میں جو گہری اور سچی رفاقت تھی، میں سمجھتی ہوں کہ اس کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کا گہرا اثر قبول کیا ہو گا لیکن والدہ عین جوانی میں اپنے سب کام ادھورے اور ننھے ننھے بچے چھوڑ کر خدا کو پیاری ہو گئیں تھیں۔ میں اس وقت پورے دو سال کی بھی نہ تھی اس لیے میں نہ ان کی ذہنی صلاحیتوں سے فیضاب ہو سکی اور نہ ان کی تعلیم و تربیت کی نعمت پا سکی۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی ان کا نام، ان کا ذکر، ان کی ذہانت اور قابلیت کا شہرہ ہر کسی کی زبان سے سنا۔ اپنی ماں، پھوپھیوں اور چچاؤں کو ان کے ذکر کے ساتھ آنسوؤں کا دریا بہاتے پایا، ان کی تصنیف کردہ کتابیں اور ان کی وسیع لائبریری دیکھی اور غیر شعوری طور پر ان سب کا گہرا اثر قبول کیا اور میرے کچے ذہن میں ایک آئیڈیل انسان کا جو تصور کسی گوشے میں پلتا بڑھتا رہا وہ والد کے خیالی ہیولے سے بہت کچھ ملتا جلتا

تھا۔ جوں جوں میری عمر بڑھتی رہی یہ احساس شدت پکڑتا گیا کہ مجھے اس بڑے انسان کی بیٹی کہلانے کے لائق بننا ہے۔ والدہ کی شخصیت اور صفات اور ان کے تصور کا میرے ذہن نے کتنا گہرا اثر قبول کیا، اس کو صرف میں محسوس کر سکتی ہوں، بیان نہیں کر سکتی۔

ایک اور شخصیت میرے بڑے چچا خواجہ غلام الحسنین کی ہے جس نے میرے مذہبی عقیدوں اور اسلام کے تصور پر بہت اثر چھوڑا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم دین تھے جنہوں نے اسلام کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس کی روح کو سمجھ کر اس کی صحیح تعلیم دینے کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ وہ توہمات، سطحی مذہبی رسموں، غلط عقیدوں اور اوہام کا جو جال مذہب کے گرد پھیلا ہے اس کے بڑے مخالف تھے اور انہیں اسلام کی صحیح تعلیم کے منافی سمجھتے تھے۔ اپنے خاندان کے بچوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس کرانے کی انہوں نے ہمیشہ کوشش کی۔ میرے بڑے بھائی سیدین صاحب نے ان ہی سے عربی اور مذہبی تعلیم کا درس لیا تھا۔ ان کے کردار میں ایک سچے عالم، ایک مرد فقیر، ایک باخدا انسان کا ایسا دلکش جلوہ نظر آتا تھا جو اسلام کے ابتدائی دور کے بعض سچے عالموں اور خادموں کا طرہ امتیاز تھا اور جن کو خاصانِ خدا کا رتبہ ملا تھا۔

بچپن میں میرے دل میں اعلیٰ تعلیم پانے کی تمنا تھی۔ اپنے ابا میاں اور بھائی جان کی طرح خوب پڑھوں گی، ڈگریاں لوں گی، ڈاکٹر بنوں گی، مگر میرے یہ خواب پورے نہ ہوئے۔ ہاں ایک دوسرے میدان میں اپنے پر نانا اور باپ کی ذہنی رفاقت اور روحانی شاگردی قدرت نے میرے لیے مقدر کی تھی۔

لیکن یہ سب تو سوچنے سے خیال میں آتا ہے۔ حقیقت میں جس ہستی نے میری صلاحیت کو پرکھا اور میری ذہنی نشو و نما میں نمایاں حصہ لے کر مجھے کسی قابل بنایا وہ میرے بھائی خواجہ غلام السدین ہیں۔ وہ پیدائشی معلم ہیں جن کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت اور مقصد یہ رہا ہے کہ بچوں کو تعلیم کا شوق دلائیں۔ علم کی پیاس پیدا کریں اور ان کی قدرتی صلاحیتوں کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع دیں اور ہمت افزائی کریں۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں ان کی سب سے پہلی طالب علم ہوں۔ مطالعے کا شوق تو مجھے ورثہ میں ملا تھا (اور سارا گھر طرح طرح کی کتابوں سے بھرا پڑا تھا)۔ جن کتابوں کا کچھ بھی حصہ سمجھ میں آجاتا وہ بس میں پڑھ لیتی تھی۔ لیکن بھائی جان نے صحیح قسم کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کیا اور اچھی اچھی کتابیں لا کر دیں۔ انگریزی کتابیں پڑھنے ہی کی قابلیت نہ تھی سمجھنے کی صلاحیت کہاں سے ہوتی مگر انہوں نے ہمیشہ مجھے ابھارا کہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر میں انگریزی کتابیں پڑھتی رہوں چنانچہ مجھے یہ چاٹ بھی لگ گئی اور اس طرح انگریزی ادب اور اس کے ذریعے دوسری زبانوں کی بعض بلند پایہ کتابوں سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ شروع سے میری لکھی اوندھی سیدھی چیزوں کو پڑھتے، مشورہ دیتے اور زبان ٹھیک کرتے تھے اور بقول ان کے مذاق مذاق میں انہوں نے مجھے ادیب بنا دیا۔ تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں میری جو سب سے پہلی کہانی رسالہ ''نور جہاں'' میں چھپی وہ انہیں کی سنائی ایک انگریزی کہانی کا چربہ تھی۔ برسوں تک میری کوئی کہانی کوئی مضمون ان کی اصلاح کے بغیر شائع نہیں ہوا۔ اب کہ وہ اتنے مصروف اور میں اتنی مشہور ہوں اب بھی کوئی اہم چیز لکھتی ہوں تو اکثر مدت تک وہ اس انتظار میں پڑی رہتی ہیں کہ وہ پڑھ کر اس پر تنقید کریں یا صادر کریں۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)
1۔ بچے کی شخصیت پر سب سے زیادہ اثر کس کا پڑتا ہے؟
2۔ مصنفہ نے کن شخصیات کا ذکر اپنے اس مضمون میں کیا ہے۔ اس کو مختصراً بیان کیجیے۔

5.5 متنCoorg(4)

Midway between Mysore and the coastal town of Mangalore sits a piece of heaven that must have drifted from the kingdom of gold. This land of rolling hills is inhabited by a proud race of martial men, beautiful women and wild creatures.

Coorg, or Kodagu, the smallest district of Karnataka, is home to evergreen rainforests, spices and coffee plantations. Evergreen rainforests cover thirty percent of this district. During the monsoons, it pours enough to keep many visitors away. The season of joy commences from September and continues till March. The weather is perfect, with some showers thrown in for good measure. The air breathes of invigorating coffee. Coffee estates and colonial bungalows stand tucked under tree canopies in prime corners.

The fiercely independent people of Coorg are possibly of Greek or Arabic descent. As one story goes, a part of Alexander's army moved south along the coast and settled here when return became impractical. These people married amongst the locals and their culture is apparent in the martial traditions, marriage and religious rites, which are distinct from the Hindu mainstream. The theory of Arab origin draws support from the long black coast with an embroidered waist-belt worn by the Kodavus, known as Kuppia, it resembles the kuffia worn by the Arabs and the Kurds.

Coorgi homes have a tradition of hospitality and they are more than willing to recount numerous tales of valour related to their sons and fathers. The Coorg Regiment is one of the most decorated in the Indian Army and first Chief of the Indian Army General Cariappa, was a Coorgi. Even now, Kodavus are the only people in India permitted to carry firearms without a

licence.

The river, Kaveri, obtains its water from the hills and forests of Coorg. Mahaseer - a large freshwater fish-abound in these waters. Kingfishers dive for their catch, while squirrels and langurs drop partially eaten fruit for the mischief of enjoying the splash and the ripple effect in the clear water. Elephants enjoy being bathed and scrubbed in the river by their mahouts.

The most laidback individuals become converts so the life of high-energy adventure with river rafting, canoeing, rappelling, rock climbing and mountain biking. Numerous walking trails in this region are a favourite with trekkers.

Birds, bees and butterflies are there to give you company. Macaques, Malabar squirrels, langurs and slender lorts keep a watchful eye from the tree canopy. I do, however, prefer to step aside for wild elephants.

The climb to the Brahmagiri hills brings you into a panoramic view of the entire misty landscape of Coorg. A walk across the rope bridge leads to the sixty - four - acre island of Nisargadhama. Running into Buddhist monks from India's largest Tibetan settlement, at nearby Bylakuppe, is a bonus. The monks, in red, ochre and yellow robes, are amongst the many surprises that wait to be discovered by visitors searching for the heart and soul of India, right here in Coorg.

Check Your Progress
1. Where is coorg?
2. What do you know about the people of coorg and their culture?

5.6 متن(5)A Truely Beautiful Mind

1۔ Albert Einstein was born on 14 March 1879 in the German city of Ulm,

without any indication that he was destined for greatness. On the contrary, his mother thought Albert was a freak. To here his head seemed much too large.

2- At the age of two - and -a -half, Einstein still wasn't talking. When he finally did learn to speak, he uttered everything twice. Einstein did not know what to do with other children, and his playmates called him "Brother Boring". So the youngster played by himself much of the time. He especially loved mechanical toys. Looking at his newborn sister, Maja, he is said to have said: "Fine, but where are her wheels?

3- A headmaster once told his father that what Einstein chose as a profession wouldn't matter, because "He'll never make a success at anything". Einstein began learning to play the violin at the age of six, because his mother wanted him to; he later became a gifted amateur violinist, maintaining this skill throughout his life.

4- But Albert Einstein was not a bad pupil. He went to high school in Munich, where Einstein's family had moved when he was 15 months old, and scored good marks in almost every subject. Einstein hated the school's regimentation, and often clashed with his teachers. At the age of 15, Einstein felt so stifled there that he left the school for good.

5- The previous year, Albert's parents had moved to Milan, and left their son with relatives. After prolonged discussion, Einstein got his wish to continue his education in German-speaking Switzerland, in a city which was more liberal than Munich.

6- Einstein was highly gifted in mathematics and interested in physics, and after finishing school, he decided to study at a university in Zurich. But science wasn't the only thing that appealed to the dashing youngh man

with the wairus moustache.

7- He also felt a special interest in a fellow student, Mileva Maric, whom he found to be a "clever creature". This young Serb had come to Switzerland because the University in Zurich was one of the few in Europe where women could get degrees, Einstein saw in her an ally against the "philistines" - those people in his family and at the university with whom he was constantly at odds. The couple fell in love. Letters survive in which they put their affection into words, mixing science with tenderness. Wrote Einstein: "How happy and proud I shall be when we both have brought our work on relativity to a victorious conclusion."

8- In 1900, at the age of 21, Albert Einstein was university graduate and unemployed. He worked as a teaching assistant, gave private lessons and finally secured a job in 1902 as a technical expert in the patent office in Bern. While he was supposed to be assessing other people's inventions, Einstein was actually developing his own ideas in secret. He is said to have jokingly called his desk drawer at work the 'bureau of theoretical physics."

9- One of the famous papers of 1905 was Einstein's special theory of relativity, according to which time and distance are not absolute. Indeed, two perfectly accurate clocks will not continue to show the same time if they come together again after a journey if one of them has been moving very fast relative to the other. From this followed the world's most famous formula which describes the relationship between mass and energy:

$$E=mc2$$

10- While Einstein was solving the most difficult problems in physics, his private life was unraveling. Albert had wanted to marry Mileva right after

finishing his studies, but his mother was against it. She thought Mileva, who was three years older than her son, was too old for him. She was also bothered by Mileva's intelligence. "She is a book like you", his mother said. Einstein put the wedding off.

11. The pair finally married in January 1903, and had two sons. But a few years later, the marriage faltered. Mileva, meanwhile, was losing here intellectual ambition and becoming an unhappy housewife. After years of constant fighting, the couple finally divorced in 1919. Einstein married his cousin Elsa the same year.

Check Your Progress

1. What do you understand by "A Truly Beautiful Mind?"

_____

_____

5.7 خلاصہ (Summary)

- 11 نومبر مولانا آزاد کا یوم پیدائش ہے جسے حکومت آندھرا پردیش نے ''یوم تعلیم'' کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔
- مولانا آزاد آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے اور گیارہ برس تک اس عہدے پر فائز رہے۔

1۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ان کا نام زبان پر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کا تذکرہ نہیں بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیر بحث ہیں۔

2۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک بہترین صحافی بھی تھے۔اردو صحافت کے دامن میں انہوں نے اب سے تقریباً ایک صدی پہلے جو کچھ ڈال دیا تھا آج تک اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکا۔ خطابت میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔

3۔ ان کی پہلی غزل بمبئی سے نکلنے والے گلدستہ ''ارمغان فرخ'' جنوری ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔انہوں نے اپنا تخلص ''آزاد'' رکھا۔

- مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز 1899ء میں ''نیرنگ عالم'' کی اشاعت سے ہوتا ہے۔1900ء میں دوسرا ہفت روزہ اخبار ''المصباح'' جاری کیا جو مصر کے اخبار ''المصباح الشرق'' کی تقلید میں تھا۔
- متن 'کھیل کود اور تعلیم' میں مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ کھیل بچوں کو صحت مند توانا اور تندرست رکھنے کے لیے کتنا ضروری ہے۔ کھیل ذہنی اور عقلی تربیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔دماغی محنت کے بعد تکان محسوس ہوتی ہے۔ کھیل کے بعد وہ پھر تازہ دم ہو جاتا ہے۔

5.8 فرہنگ (Glossary)

ناقد	:	عیب وہنر جانچنے والا
ارمغان	:	تحفہ، ہدیہ پیشکش
آشنا	:	آگاہ، باخبر، واقف

5.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Type Questions)

1۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی زندگی کا کب آغاز ہوا؟

1901(1) 1899(2) 1897(3) 1903(4)

2۔ کھیل کود کی افادیت میں شامل ہے۔

(1) صحت مند توانا اور تندرست جسم (2) سماجی تربیت

(3) عقلی تربیت (4) ان میں سبھی

3۔ When was Albert Eistein married?

1903(1) 1906(2) 1907(3) 1908(4)

مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1۔ مولانا آزاد کی تعلیمی فکر کو مختصر بیان کیجیے۔

2۔ ''کھیل سماجی تربیت کا اہم ذریعہ ہے۔'' اس قول کی وضاحت کیجیے۔

3۔ سلسلۂ روز وشب متن میں مصنفہ نے ماں کا تذکرہ کس انداز سے کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1۔ مولانا آزاد کی زندگی کے بارے میں جو معلومات پیش کی گئی ہیں، انہیں اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

2۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کے مختلف مضامین (زبان و غیر زبان) کی درسی کتب سے چند متون کو منتخب کیجیے اور ان کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

3۔ اپنے ہم عمر ساتھیوں (Peers) کے ساتھ گروپ تشکیل دیجیے اور مختلف عنوانات پر متون کا انتخاب کرتے ہوئے ان کا مطالعہ کیجیے۔ پھر ان متون کا تنقیدی جائزہ اپنے گروپ میں پیش کیجیے۔

4۔ Describe the scenic beauty of Coorg as depicted in this text in your own words.

5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

1- ڈاکٹر نجم السحر ''مولانا ابوالکلام آزاد''

2- محمد اسحاق ''کھیل کود اور تعلیم''، مشمولہ ''تعلیم ایک تحریک، ایک چیلنج''، کل ہند تعلیمی تحریک، نئی دہلی۔

3- صالحہ عابد حسین ''سلسلہ روز و شب''، مشمولہ ''گلزار ادب (دوم) بورڈ آف انٹر میڈیٹ ایجوکیشن، حیدرآباد۔

4- "A Truely Beautiful Mind" - Beehive, Text Book in English for Class IX (NCERT)

5- "Coorg" First Flight, Text Book in English for Class X (NCERT)

اکائی6۔ معروف مضامین پر مبنی وضاحتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا(حصہ دوم)

(Engaging with Popular Subject Based Expository Writing Part-2)*

اکائی کے اجزاء

6.0 تمہید(Introduction)

6.1 مقاصد(Objectives)

6.2 متن(ا): علامہ اقبال کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی

6.3 خلاصہ(Summary)

6.4 اکتسابی نتائج(Learning Outcomes)

6.5 فرہنگ(Glossary)

6.6 نمونہ امتحانی سوالات(Model Examination Questions)

6.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد(Suggested Reading Materials)

6.0 تمہید(Introduction)

خطوط نویسی ایک اخلاقی شعار بھی ہے اور سماجی ضرورت بھی۔ خطوط کو ہمیشہ دو افراد کے درمیان شخصی معاملہ سمجھا گیا ہے۔ خطوط میں لکھنے والے کے خیالات کی گہرائیاں، احساسات کی صداقتیں اور جذبات کی گرم جوشیاں ہوتی ہیں۔ لکھنے والا اس خیال سے لکھتا ہے کہ کوئی تیسرا اس سے واقف نہیں ہو سکے گا۔ لیکن ادب میں مشاہیر کے خطوط کی اشاعت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اسی طرح اردو میں خطوط نگاری کی رسم گزشتہ دو سو برس سے جاری ہے۔ آپ نے غالب کے خطوط تو پڑھے ہوں گے۔ ان خطوط سے نہ صرف یہ کہ غالب اور ان کے ساتھیوں کے حال احوال کا پتہ چلتا ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے اس دور کے حالات کو سمجھنے کے لیے بھی یہ دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے ''غبار خاطر'' کا بھی مطالعہ کیا ہوگا جو مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے قید کے دوران اپنے دوست ہارون خان شیروانی کو لکھے تھے۔ ان دونوں مکاتیب کے مجموعوں کا تقابل کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلوب بیان بالکل جداگانہ ہے۔ جہاں غالب نے ''مراسلہ کو مکالمہ بنادیا'' وہیں مولانا آزاد نے اپنے خطوط میں فلسفہ، تاریخ، نفسیات اور دیگر بے شمار علمی موضوعات پر نہایت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور ایک خاص بات یہ کہ اپنے تمام خطوط میں ''مکتوب الیہ'' یعنی جس کو خط لکھا جارہا ہے، نام کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

* Prof. Najmus Saher, Professor, Centre for Distance and Online Education, MANUU

غالبؔ کے خطوط ان کی زندگی میں چھپے اور مقبول ہوئے۔ یہ غالب کا فیض ہے کہ اردو میں ایک صنف ادب کا اضافہ ہوا۔ وہیں سے یہ چلن عام ہوا کہ مشاہیر کے خطوط شائع ہونے لگے۔

اس اکائی میں اردو ادب کے دو اہم مشاہیر کے درمیان لکھے گئے خطوط کو پیش کیا جارہا ہے۔ علامہ اقبال کے چند منتخب کردہ خطوط پروفیسر سید شفقت رضوی کی مرتبہ تصنیف ''مکاتیب سر محمد اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی'' سے لیے گئے ہیں۔ مولف نے ان دونوں شخصیات کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

بیسویں صدی کے نصف اول میں برصغیر کے مسلمانوں کو جن اکابرین کی رہنمائی حاصل ہوئی، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی اور علامہ شیخ محمد اقبال جیسی نابغہ روزگار شخصیات بھی شامل تھیں۔ مولانا ندوی علوم مشرقی پر انتہائی گہری نظر رکھنے کے علاوہ مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے امام تھے، تو علامہ فلسفہ و حکمت اور شعر و ادب سے شغف رکھتے تھے۔ ان میں مشترک اقدار اسلام سے بے پناہ محبت، اس کی نشاۃ ثانیہ کی امنگ اور ذات رسولؐ سے والہانہ عقیدت تھی۔ برصغیر کے مسلمان ذہنی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی انحطاط کا شکار تھے۔ اسلام سے روگردانی نے ان کی روح کی بالیدگی کو ختم کر دیا تھا۔ معاملات دنیاوی میں وہ حوصلہ و ہمت ہار چکے تھے۔ غلامی نے ان کی فطری صلاحیتوں کو بے جان بنا دیا تھا۔ مغربی اور غیر اسلامی افکار، رجحانات اور عقائد کی یلغار میں وہ اپنی منزل کھو چکے تھے۔ اس دور انحطاط میں اصلاح، تعلیم اور جہاد کی کئی تحریکیں شروع ہوئیں، لیکن ان کے اثرات وقتی رہے۔ ضرورت ایک ہمہ گیر ذہنی و فکری انقلاب کی تھی جو ایک طرف مغرب کی برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کا حوصلہ دے تو دوسری طرف مغرب کی مادی ترقی اور کارآمد نظریات سے مستفیض ہونے کی صلاحیت بھی پیدا کر دے۔ علامہ اقبال کی یہ خوش نصیبی تھی کہ ارتقائے فکر کی اولین منزلوں میں انہوں نے مغربی علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کو بغور دیکھا اور جانچا۔ ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور کیا اور ان کا مقابلہ اصول و اقدار اسلامی سے کر کے ایسی راہ متعین کرنے کی سعی کی جو عالم اسلام کے لیے مفید ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان مغرب کی گمراہ کن معاشرتی روایات کو نظر انداز کر دیں، البتہ جدید سائنس نے فطرت کے جن رازوں کی نقاب کشائی کی ہے ان سے استفادہ ضرور کریں۔ یہ جدید سائنس مسلمانوں کی متاع گمشدہ ہے۔ کبھی ان کی مبادیات سے اہلِ اسلام نے دنیا کو روشناس کروایا تھا۔ اور آج وہی ان سے بے بہرہ ہیں۔ ذہنوں پر پہرے بٹھانے والوں نے اسلام کو خانقاہوں اور مسجدوں تک محدود کر دیا تھا۔ عام زندگی دینی اور دنیاوی شعبوں میں اس طرح بٹ گئی تھی کہ ان کے درمیان مغائرت ہی نہیں تضاد کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس ہیجانی دور نے علامہ کو روحانی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ

> ''میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خداوند کریم سے میرا دل مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے'' (خط مرقومہ ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء)۔

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ عالم اسلام سے بے خبری اور لاعلمی بلکہ جہالت کی گھٹاؤں کو دور کر کے قدیم و جدید، مشرقی و مغربی افکار سے استفادہ کر کے ایک لائحہ عمل مرتب کریں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے تلاش و جستجو، تحقیق و تفکر کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ وہ قدیم علوم کے بحر بیکراں سے سارے موتی جمع کر کے اپنے اشعار، خطبات اور مقالات کو آبدار بنانا چاہتے تھے۔ یہ بہت بڑا مشن تھا۔ اس کے لیے

انہیں اپنی معلومات میں کمی کی خلش تڑپا دیتی اور وہ صاحبِ علم اور صاحبِ نظر حضرات کے تعاون کے خواستگار ہوتے۔ یہ بھی علامہ کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا اور ہر اس ذریعے کو روبکار لانے میں دریغ نہیں کیا جس سے خلش کو دور کیا جاسکتا۔ برصغیر کے علما میں وہ علامہ شبلی کے بعد مولانا سلیمان ندوی کے تبحر علمی کے قائل تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ایک عظیم استاد کے عظیم شاگرد ہونے کا حق انہوں نے ''سیرت النبی'' کی تکمیل کے ذریعے ہی ادا نہیں کیا بلکہ تمام قدیم علوم' اسلامی شرح وفقہ اور تاریخ میں وہ عبور حاصل کیا کہ دنیائے اسلام میں ان کا ثانی نہ تھا۔ مولانا ندوی اور علامہ اقبال کے درمیان شخصی رابطہ قرآن السعدین تھا۔ ان کے درمیان بلحاظ علم ودانش ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا ممکن نہیں ہے۔ بعض امور میں مولانا ندوی کی برتری کو تسلیم کرنا پڑے گا تو بعض میں علامہ کی۔ باوجود اس کے کہ علامہ عمر میں مولانا سے بڑے تھے، انہیں متذکرہ شعبوں میں سند کا درجہ دیتے تھے۔ اپنے شک وشبہ کو دور کرنے کے لیے مولانا کو معلم ورہنما سمجھتے تھے اور جب وہ اس طرح کے جملے لکھتے تو ان میں تصنع دکھائی نہیں دیتا بلکہ خلوص نیت کی خوشبو آتی ہے کہ

''مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا'' (خط مرقومہ ۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء)۔

''میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیا کیجیے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی، لیکن مجھے فائدہ ہوگا'' (خط مرقومہ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء)۔

''میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں گا۔ اگر آپ از راہ عنایت اپنی وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں (خط مرقومہ یکم فروری ۱۹۲۴ء)۔

''علامہ اسلام کی جوے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے''

''جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے وہ اگر زمانے نے فرصت دی تو باقی عمر کے لیے کافی ہے'' (خط مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۲۲ء)۔

مولانا سید سلیمان ندوی بھی اقبال کے مرتبہ شناس تھے۔ ایک طرح سے ان کے استاد کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود ان کی بلندی فکر' فلسفہ دانی' اسلام سے محبت' مسلمانوں کی خیر خواہی اور ذہنی انقلاب کی جستجو کی تعریف کرتے ہوئے انہیں اسی بلند مقام پر رکھ کر' جس کے وہ مستحق تھے، ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ مولانا کو اقبال شناسی کا جوہر اپنے استاد علامہ شبلی سے وراثت میں ملا تھا۔ یوں تو کلام اقبال پر ''معارف'' میں شائع شدہ ان کے تبصروں میں کلمات تحسین کی کمی نہیں لیکن ان کے جذبات کی حقیقی ترجمانی علامہ کے تعزیتی مضمون کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے، انہوں نے لکھا تھا:

> ''اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا۔ وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چین، بلکہ وہ حکیم جو اسرار کلام الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے۔ وہ نئے فلسفے کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا۔ یعنی بادہ انگور نچوڑ کر کوثر وتسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا'' (معارف مئی ۱۹۳۸ء)۔

> ''وہ ہندوستان کی آبرو' مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی اور ایسا عارف فلسفی' عاشق رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو اور اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم اور اس کے دل کی ہر

فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بال جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی لیکن ان کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر ان شاءاللہ باقی رہے گا"(ایضاً)۔

مولانا ندوی نے ان کے خطوط کو اتنی اہمیت دی کہ محفوظ بھی رکھا اور ان کے جانشین شاہ معین الدین ندوی نے اپریل ۱۹۵۴ء تا مارچ ۱۹۵۵ء کے معارف میں بالاقساط شائع بھی کیا۔

اس تفصیلی تعارف سے آپ ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ

- اردو میں خطوط نگاری بحیثیت ادبی صنف واقف ہو سکیں۔
- مشاہیر کے خطوط کی ادبی، سماجی و تاریخی اہمیت کو سمجھ سکیں۔
- علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی کے حالات زندگی نیز قوم و ملت کے لیے ان کی خدمات کو سمجھ سکیں۔

6.2 متن (۱) علامہ اقبال کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی

(۱)

لاہور ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ قوت روح اور اطمینان قلب کا باعث ہے۔ میں ایک مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد ان ہی نتائج پر پہنچا ہوں، جو آپ کے والا نامے میں درج ہیں۔ جو کام آپ کر رہے ہیں جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔

آپ کو خیر القرون قرنی والی حدیث یاد ہو گی۔ اس میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت میں تین قرون کے بعد سمن (**ویظھر فیھم السمن**) کا ظہور ہو گا۔ میں نے اس پر دو رتین مضامین اخبار وکیل امرتسر میں شائع کیے تھے جس کا مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ "سمن" سے مراد رہبانیت ہے، جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی۔ ائمہ محدثین نے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یہ لکھا ہے کہ اس لفظ سے مراد عیش پرستی ہے، مگر لسانی تحقیق سے محدثین کا خیال صحیح نہیں کھلتا۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی اور علالت کی وجہ سے میں ان مضامین کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنبت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے، مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریت کا ہے، جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں حالانکہ حضرت محی الدین کا مقصود اسلامی تصوف کو

عجمیت سے پاک کرنا تھا۔

مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین موسیو مسیگنان ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں۔ انشاءاللہ معارف کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی اس واسطے بہت کم لکھتا ہوں۔ مثنوی اسرار خودی کا دوسرا حصہ یعنی رموز بے خودی (اسرار حیات ملیہ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے۔ شائع ہونے پر ارسال خدمت کروں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص: محمد اقبال

(۲)

لاہور ۲۸اپریل۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ رموز بے خودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

آج مولانا ابوالکلام آزاد کا خط آیا ہے، انہوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔ مولانا شبلیؒ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں، اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہو گا، اسرار خودی کا دوسرا ایڈیشن تیار کر رہا ہوں، عنقریب آپ کی خدمت میں مرسل ہو گی۔

رسالہ صوفی میں میں نے کوئی نظم شائع نہیں کی، کوئی پرانی مطبوعہ نظم انہوں نے شائع کر دی ہو گی، ورنہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں صوفی کو معارف پر ترجیح دوں۔ معاف ایک ایسا رسالہ ہے، جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ میں انشاءاللہ ضرور آپ کے لیے کچھ لکھوں گا۔ یہ وعدہ کچھ عرصہ ہوا میں نے آپ سے کیا تھا اور میں اس وقت تک پورا نہیں کر سکا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام

مخلص: محمد اقبال۔ لاہور

(۳)

لاہور ۱۰مئی۱۹۱۸ء

مخدوم مکرم جناب مولوی صاحب! السلام علیکم

معارف میں ابھی آپ کا ریویو (مثنوی رموز بے خودی) نظر سے گزرا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہو گا، لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے۔

غالباً آپ نے ''رموز بے خودی'' کے صفحات پر ہی نوٹ کیے ہوں گے؟ اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجیے، میں دوسری کاپی اس

کے عوض میں آپ کی خدمت میں بھجوادوں گا۔

اس تکلیف کو میں ایک احسان تصور کروں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص: محمد اقبال۔ لاہور

(۴)

لاہور ۲۳ مئی ۱۹۱۸ء

مخدومی مولونا! السلام علیکم

چند اشعار معارف کے لیے ارسال خدمت ہیں۔ ان میں سے جو پسند آئے، اسے شائع کیجیے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوے سامری تو قتیل شیوہ آذری

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایت غم آرزو تو حدیث ماتم دلبری

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفس عدم
ترا دل حرم گرد عجم، ترا دیں خریدہ کافری

تری راکھ میں ہے اگر شرر، تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہان میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

کوئی ایسی طرز طواف تو مجھے اے چراغ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشت سمندری

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیان کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

کرے اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

مخلص: محمد اقبال۔ لاہور

(۵)

لاہور ۸ ستمبر ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم

"رموز بے خودی" کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا، اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہو گیا، امید کہ توجہ فرمائی

جائے گی، تاکہ میں دوسرے ایڈیشن میں آپ کے ارشادات سے مستفید ہو سکوں۔

وساتیر کے حوالوں کے متعلق آپ نے لکھا تھا۔ اس وقت اورینٹل کالج لاہور کا کتب خانہ بند تھا، اور اب بھی بند ہے، اکتوبر میں کھلے گا۔ اگر کچھ حوالے دستیاب ہو گئے تو عرض کروں گا۔ والسلام

مخلص: محمد اقبال

روس کے مسلمانوں کے متعلق جو مضمون معارف میں شائع ہوا ہے اسے ایک علاحدہ رسالے کی صورت میں شائع کرنا چاہیے۔

محمد اقبال

(۶)

لاہور ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء

مخدوم مکرم جناب مولانا! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لیے نہایت ممنون ہوں مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ میں چند روز کے لیے شملہ گیا تھا، وہاں معلوم ہوا کہ آپ بھی تشریف رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے ایک ضروری کام درپیش تھا، جس میں مصروفیت رہی۔ البتہ معنوی طور پر آپ کی صحبت رہی، کیونکہ رات کو سیرت نبوی کا مطالعہ رہتا تھا۔ مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا جس کا صلہ دربار نبوی سے عطا ہو گا۔

قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا، بالکل بجا ہے۔ مگر چونکہ شاعری اس مثنوی (۱) سے مقصود نہ تھی، اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا۔ اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کی قوافی کی مثالیں ملتی ہیں، اور ظہوری کی ساقی نامہ کے چند شعر بھی زیر نظر تھے۔ غالباً اور مثنویوں میں بھی ایسی مثالیں ہوں گی۔

اصول تشبیہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہو سکتی۔ قوت واہمہ کے عمل کی رو سے بیدل و غنی کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ گو کتب بلاغب کے خلاف ہے۔ زمانہ حال کے مغربی شعراء کا بھی طرز عمل یہی ہے۔ تاہم آپ کے ارشادات نہایت مفید ہیں اور میں ان سے مستفید ہونے کی پوری کوشش کروں گا۔

بحر تلخ رو، کلمہ بسکون لا، باریک تراز جو (بمعنی کم در عرض و عمق) کوری ذوق، محفل از ساغر رنگیں کردن، سرمہ اودیدۂ مردم شکست، سازِ برق آہنگ، از گلِ غربت (بمعنی شر) نوابالیدن، صبح آفتاب اندر قفس وغیرہ کی مثالیں اساتذہ میں موجود ہیں۔ مگر اس خیال سے کہ آپ کا وقت ضائع ہو گا نظر انداز کرتا ہوں، البتہ اگر آپ اجازت دیں تو لکھوں گا محض یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میں نے غلط مثالیں تو انتخاب نہیں کیں۔

ایک امر دریافت طلب ہے اس سے آگاہ فرما کر ممنون کیجیے، ''قطرہ از نرگس شہلا ستی'' پر جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے میں نہیں سمجھ سکا، کیا آپ کا یہ مقصود ہے کہ قطرے کا لفظ شہلا کے لیے (یعنی قطرہ شہلا) موزوں نہیں یا کچھ اور؟ (علی ہذا القیاس) ''خیمہ برزد در حقیقت از مجاز''، ''نعرہ زد شیرے از واماند شت''، ''باز بانت کلمہ توحید خواند'' کے متعلق بھی یہی سوال ہے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔اس طویل خط کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

مخلص: محمد اقبال

(۱)اسرار خودی

مخلص: محمد اقبال

(۷)

لاہور ۲۳اکتوبر ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کے دونوں نوازش نامے مل گئے جن کے لیے سراپاسپاس ہوں۔ میں بخار میں مبتلا تھا اس لیے جواب نہ لکھ سکا۔اس کے علاوہ ٹیک چند بہار کی ابطال ضرورت میرے پاس لاہور میں موجود نہ تھی۔اس رسالہ میں لفظ کلمہ پر بحث ہے، دیکھ کر جواب عرض کروں گا اور باقی اسناد بھی لکھوں گا۔

سیر فارسی میں ان معنوں میں آتا ہے سیر کردن، سیر زدن، سیر داشتن، بلکہ سیر دیدن بھی،

عمرہا صائب بشہر عقل بودم کوچہ بند
مدتے ہم باغزالاں سیر صحرا می زنم (مخلص کاشی)

تماشا دار وائے مہ باتو سیر گلستاں کردن
کہ از شرم رخت ہر گل بچندیں رنگ خواہد شد

لفظ نعرہ حیوانات کی آواز کے لیے بھی آتا ہے۔اس وقت نعرہ اسپ کی، سند موجود ہے اور مجھے یاد ہے، شیر کے لیے بھی مستعمل ہوا ہے۔انشاءاللہ عرض کروں گا۔ مگر میں نے اور وجوہ سے اس شعر میں ترمیم کر دی ہے۔اس میں کچھ شک نہیں کہ غریدن بہت بہتر ہے۔ دست اور بیشہ مرادف بھی آتے ہیں اور دشت کے لیے ضرور نہیں کہ بالکل خشک ہو۔

مپرس از آب و رنگ کوہسارش
ہزاراں دشت لالہ داغدارش (یحییٰ شیرازی)

دشت در معنی آبادی و ویرانہ آیا ہے اور معنی کلّیت کے پیدا کرتا ہے۔ مگر اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں کہ میں نے ہر دو اشعار زیر بحث میں ترمیم کر دی ہے، دشت و در ایسا ہی ہے جیسے کوہ و دشت، پست و بلند سے تقطیع بھی نہیں گرتی۔آپ نے مصرع صحیح نہیں لکھا:

ع: نعرہ زد شیرے در دامان دشت

نہیں بلکہ

ع: ''نعرہ زد شیرے از دامان دشت''

ہے۔ باقی باتیں انشاءاللہ دوسرے خط میں عرض کروں گا۔

جس توجہ سے آپ نے تنقیدی خطوط لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اس کے لیے نہایت شکر گزار ہوں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر

ہو گا۔

مخلص: محمد اقبال۔ لاہور

(۸)

لاہور ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم

اسناد حسب وعدہ حاضر ہیں۔

از گل غربت زماں گم کردہ (رموز)

(۱) ع:

آپ کا ارشاد اس مصرعے پر یہ تھا کہ ''از گل'' بمعنی بدولت اچھے معنوں میں آتا ہے، برے معنوں میں نہیں آتا۔ بہار عجم میں زیر لفظ ''گل'' یہ محاورہ بھی دیا ہے اور اشعار بھی دیے ہیں:

ع: زیر دست چرخ بودن از گل بے فطرتی ست

(۲) ع: محفل رنگیں بیک ساغر کند (رموز)

نہ ہفتاد و دو ملت گردش چشم تو می سازو

بیک پیمانہ رنگین کردہ یک شہر محفلہا (ناصر علی)

(۳) ع: سرمہ اَو دیدۂ مردم شکست (رموز)

ع: چشم و گوش شکستن، یعنی نابینا شدن (بہار عجم)

ع: ترسم ز گریہ چشم گہر بار بشکند (صائب)

(۴) عشق را داغے مثال لالہ بس

در گریبانش گل یک نالہ بس (رموز)

گل نالہ پر آپ کا ارشاد تھا۔

چنگے بتار نغمہ قانون شیر زن

گلبرگ نالۂ بگریبان دل نشاں (زلالی)

(۵) ز آسمان آبگوں یم می چکد

من ز جو باریک تر می سازمش

لفظ ''باریک'' پر آپ کا ارشاد تھا کہ صحیح نہیں۔ باریک بمعنی کم در عرض و عمق بھی آیا ہے۔

نازک تر است از رگ جاں گفتگوے من

باریک شد محیط چوں آمد بجوے من (صائب)

از تواضع می تواں مغلوب کردن خصم را

می شود باریک چو سیلاب ازپل بگذرد

(۶)ع: گورذوقاں داستانہا ساختند (رموز)

کورذوق کی نسبت آپ کاارشاد تھا کہ بے مزہ ترکیب ہے۔

چہ غم زین عروس سخن رابتر

کہ بر کورذوقاں شود جلوہ گر (ظہوری)

کورذوقاں زفیض تربیت

چوں مسیحامزاجدان سخن (ملاطغراء)

(۷)نوابالیدن

ع: تانوائے یک ازان بالیدہ است (رموز)

ع: تاچند بیالہ نفس اندرونوایم (بیدل)

(۸)بحر تلخ رو

ع: بود بحر تلخ رو یک سادہ دشت (رموز)

تلخ رو بحر کی صفات میں آتا ہے (بہار عجم)

(۹)نعرہ زد شیرے ازدامان دشت (رموز)

منجملہ اورارشادات کے ایک یہ ارشاد تھا کہ لفظ نعرہ شیر کے لیے ٹھیک نہیں۔ بہار عجم میں ایک شعر دیا ہے، جس میں نعرہ اسپ لکھا ہے۔

بابرماند، چوپے برنہاد ونعرہ کشاد (معزفطرت)

(۱۰) ساز برق آہنگ اونتواختہ (رموز)

آپ کاارشاد تھا کہ ساز برق صحیح نہیں، لیکن مصرعے میں ساز کی صفت برق آہنگ ہے اور برق آہنگ ساز کی صفت آتی ہے، (بہار عجم زیر لفظ ساز)

(۱۱) ہم چو صبح آفتاب اندر قفس (رموز)

آپ کاارشاد تھا کہ صبح کے لیے آفتاب کی کیاضرورت ہے۔ یہ ترکیب مرزا بیدل کی ہے۔ میں نے اس کے لیے محل استعمال نہیں پیدا کیاہے، یعنی کعبۃ اللہ کے گرداگرد جب ملت بیضا نماز پڑھتی ہے یاطواف کرتی ہے تو یہ نظارہ صبح آفتاب در قفس سے مشابہ ہے۔

ملت بیضابہ طوفش ہم نفس

ہم چو صبح آفتاب اندر قفس

(۱۲)ع:اے بصیری رار وابخشندہ(رموز)

بصیری کے متعلق بھی یہی واقعہ مشہور ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ حضورؐ نے بصیری کو جو جذام میں مبتلا تھا اپنی چادر مطہر خواب میں عطا فرمائی تھی۔ جس کے اثر سے اس نے جذام سے نجات پائی۔ بعض لوگوں میں قصیدہ بصری قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور ہے۔

(۱۳) من شب صدیق رادیدم بخواب

گل ز خاک راہ او چیدم بخواب

دوسرے مصرعے پر آپ کا یہ ارشاد تھا کہ مطلب زیادہ واضح ہونا چاہیے،اور ''گل ز خاک راہ او چیدم'' کیا مطلب؟ یہ واقعہ خواب کا ہے جو خواب میں دیکھا گیا بعینہ اسی طرح نظم کر دیا گیا۔

(۱۴) باز بانت کلمہ توحید خواند لفظ کلمہ کے متعلق بھی لکھوں گا،افسوس ہے ''ابطال ضرورت'' دستیاب نہیں ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس رسالہ میں اس لفظ پر بحث ہے۔ بہت سے الفاظ جن کو اساتذہ نے بتحریک وبسکون دونوں طرح استعمال کیا ہے،انہوں نے کمی کر دی ہے، مثلاً رب ارنی' رمضان' حرکت متوازی' وقران وغیرہ اس کا بسکون استعمال ہونا یقینی ہے۔ اسناد انشاءاللہ عرض کروں گا۔ جواہر التر کیب میں چار دفعہ بسکون لام آیا ہے

(۱۵) فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند

ہم خیال و ہم نشین و ہمسر اند(رموز)

لفظ ہم خیال کی نسبت آپ کو شبہ تھا

یاد ایامے کہ باہم آشنا بودیم ما

ہم خیال و ہم صفیر و ہم نوا بودیم ما

لیکن میں نے یہ لفظ شعر سے نکال دیا ہے۔

(۱۶) بائے بسم اللہ حضرت علیؓ کے لیے قاآنی نے لکھا ہے اور میم مروت مولانا جامی نے تحفۃ الاحرار میں لکھا ہے۔ میں نے ''میم مرگ'' لکھا تھا۔

(۱۷) قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا، صحیح ہے۔ قاعدہ یہی ہے جو آپ تحریر فرماتے ہیں۔ مولانا روم ان باتوں کی پروا نہیں کرتے، ظہوری کے دو شعر جو زیر نظر تھے عرض کرتا ہوں۔

گل شو قماز آب و گل بروید

بر قاصی از سینہ دل جہد

چو از چشم جادو بجادر رود

باعجاز پہلو بہ پہلو زند

دوسرا شعر کسی قدر مشتبہ ہے، کوئی اور اڈیشن ساقی نامہ کی دستیاب نہیں ہوئی، ورنہ مقابلہ کرتا۔ بہر حال قاعدے کی خلاف ورزی کیے بغیر اگر شعر لکھا جاسکتا ہو تو قاعدہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ انشاءاللہ ان قوافی پر نظر ڈالا کروں گا۔

(۱۸) ورشہ، دورہ، خیال وغیرہ کے متعلق آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔ لیکن ان الفاظ کے متعلق پھر بھی کچھ عرض کروں گا۔

(۱۹) شاہ رمز آگہ شد محو نماز

خیمہ بر زد از حقیقت در مجاز

نعرہ زد شیرے از دامان دشت

دشت و در از ہیبتش لرزندہ گشت

ان اشعار کے متعلق جو کچھ آپ کا ارشاد ہے، اس سے مولوی اصغر علی روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اتفاق نہیں کرتے۔ لیکن فی الحال ان پیشہ کردہ اسناد سے مجھے تسکین نہیں ہوئی۔ دو چار روز تک نتیجہ عرض کروں گا۔ ان اسناد کو ملاحظہ فرمایئے اور بتایئے کہ کون سی صحیح اور کون سی غلط ہے؟ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا مخلص: محمد اقبال۔ لاہور

(۹)

لاہور ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی روز ہو گئے ایک عرائضہ خدمت عالی میں لکھا تھا۔ جواب سے ہنوز محروم ہوں۔ ''خیمہ بر زد از حقیقت در مجاز'' کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس میں تجاوز کا مفہوم نہیں ہے، کیونکہ خمیہ بر زدن کے معنی قیام کرنے کے ہیں۔ میں تلاش میں تھا کہ کوئی سند مل جائے، جیسا کہ میں نے گذشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا۔ آج کلیات سعدی میں وہ سند مل گئی، جو ار سال خدمت ہے۔

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار

وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

بصیری کو چادر عطا ہونا کئی روایات میں آیا ہے۔ گذشتہ خط میں اس کا حوالہ لکھنا بھول گیا تھا۔ مولوی ذوالفقار علی دیوبندی نے شرح قصیدہ بردہ میں منجملہ اور روایات کے یہ روایت بھی لکھی ہے۔ مطلع فرمایئے کہ جو اسناد میں نے اپنے خطوط میں لکھے ہیں، ان کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ الفاظ، ورشہ اور خیال کے متعلق بھی عرض کروں گا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص: محمد اقبال

(۱۰)

لاہور دوسری ڈسمبر ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے۔ حالات معلوم ہونے پر طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اطمینان قلب عطا فرمائے۔ آپ کا یہ فقرہ کہ ''میرے ساتھ خدا کا معاملہ عجیب ہے'' گویا تمام ملت مرحومہ کے احساسات کا ترجمان ہے۔ جو قوم ایک مشن لے کر پیدا ہوتی ہے، اس کی روحانی تربیت کے لیے ابتلا کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ایک انگریزی مصنف جسے ابتلا کے دوررس نتائج کا تجربہ ہو چکا تھا لکھتا ہے کہ

''دکھ دیوتاؤں کی ایک رحمت عظیم ہے تاکہ انسان زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ کر سکے۔''

آپ اُمتِ محمدیہؐ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس مامور من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امر الٰہی ودیعت کیا گیا ہے۔ فرقہ یاسیہ کو چھوڑ کر فرقہ رجانیہ میں آجایئے۔ جس حقیقت کو آپ زیر پردہ دیکھ چکے ہیں اس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے۔ انشاءاللہ

زمانہ باز بیفروخت آتش نمرود

کہ بے نقاب شود جوہر مسلمانی

شخصی اعتبار سے مجھے آپ کے ساتھ حد درجہ ہمدردی ہے۔ یقین جانیے کہ آپ کے الفاظ نے میرے دل پر سوز و گداز کی کیفیت طاری کر دی اور میں دست دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آلام و مصائب میں استقامت عطا فرمائے۔

ہاں ترجمہ کی داد دیتا ہوں۔ لٹریری اغراض کے لیے یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکیں گے۔ البتہ فلسفیانہ اغراض کے لیے شاید اور الفاظ وضع کیے جائیں تو بہتر ہو گا۔

پنجاب میں بھی بیماری نے غضب ڈھایا لاہور میں تو چند روز یہ حالت رہی کہ گورکن بھی نہ مل سکتے تھے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

آپ کا مخلص: محمد اقبال

(۱۱)

لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم

ایک عرصے سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ معارف میں حضرت مولانا محمود حسین صاحب قبلہ کا ایک خط شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے طرفہ کا ایک مقبول عربی شعر نقل کیا ہے، کیا آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا کر سکتے ہیں کہ یہ خط مالٹا سے کون سی تاریخ کو لکھا گیا تھا؟ صاحب مضمون نے خط کی تاریخ نہیں بتائی۔ امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام

آپ کا مخلص: محمد اقبال

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)
1۔ خطوط نویسی کو کس طرح کی ضرورت اور شعار قرار دیا گیا ہے؟
2۔ غالبؔ کے خطوط کی ادبی و تاریخی حیثیت کیا ہے؟
3۔ ''غبار خاطر'' کن خطوط کا مجموعہ ہے اور یہ کس کو لکھے گئے تھے؟

4۔ علامہ اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی کے درمیان فکری اشتراک کس بنیاد پر تھا؟
5۔ علامہ اقبال نے مغربی علم و تہذیب کے بارے میں کیا نقطہ نظر اختیار کیا؟
6۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ اقبال کے بارے میں اپنے تعزیتی مضمون میں کیا الفاظ کہے؟

6.3 خلاصہ (Summary)

یہ اکائی اردو ادب کی ایک اہم صنف یعنی خطوط نگاری کے تاریخی، فکری اور ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ خطوط کو ایک شخصی اور سماجی اظہار کے ساتھ ساتھ فکری رابطے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اکائی میں بالخصوص علامہ اقبالؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے درمیان علمی و فکری مکاتبت کو شامل کیا گیا ہے، جس سے نہ صرف ان کے باہمی احترام اور خلوص کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ برصغیر میں اسلامی فکر، اصلاحِ معاشرہ اور نشاۃ ثانیہ کے تصور کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اقبالؒ اپنے خطوط میں تصوف، فلسفہ، تعلیم، قومیت اور امتِ مسلمہ کے احوال پر گہرے خیالات پیش کرتے ہیں، جب کہ مولانا ندویؒ ان کی علمی کاوشوں کو رہنمائی، اصلاح اور تنقید کے توازن کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ یہ مکتوبات اردو نثر کے اسلوب، فکری وسعت اور ادبی خلوص کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

6.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس مطالعہ کے بعد طلبہ نے سیکھا کہ:

- اردو ادب میں خطوط نگاری کی صنف اور اس کی خصوصیات کو بیان کر سکتے ہیں۔
- مشاہیرِ ادب کے خطوط کی ادبی، سماجی اور تاریخی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔
- علامہ اقبال اور مولانا سلیمان ندوی کے افکار و خدمات کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔
- مکتوبات میں اسلامی فکری احیا اور اصلاحی جذبے کے مظاہر کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔
- اقبال اور ندوی کے خطوط کے اسلوبِ تحریر اور تنقیدی شعور کا موازنہ کر سکتے ہیں۔

6.5 فرہنگ (Glossary)

- مکتوب —— خط یا خط کی تحریر (Written letter)
- مکاتیب —— خطوط کا مجموعہ (Collection of letters)
- اسلوب —— طرزِ بیان یا طرزِ تحریر (Style of expression)
- نشاۃِ ثانیہ —— اسلامی احیا یا روحانی تجدید (Renaissance / Revival)

- تصوف ـــ روحانی و باطنی طرزِ فکر (Mysticism)
- تبحرِ علمی ـــ علم میں گہرائی و وسعت (Scholarly depth)
- تنقید ـــ جانچ اور اصلاح کا عمل (Critical evaluation)
- فیض ـــ علمی یا روحانی اثر (Intellectual / Spiritual influence)

6.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Type Questions)

1۔ ''غبارِ خاطر'' کس کے خطوط کا مجموعہ ہے؟

(الف) سر سید احمد خان (ب) مولانا ابوالکلام آزاد (ج) حالی (د) شبلی

2۔ علامہ اقبال نے ''رموزِ بے خودی'' کس زبان میں لکھی؟

(الف) اردو (ب) فارسی (ج) انگریزی (د) عربی

3۔ ''مکاتیب سر محمد اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی'' کے مرتب کون ہیں؟

(الف) مولانا شبلی (ب) پروفیسر سید شفقت رضوی (ج) مولانا آزاد (د) حسرت موہانی

مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1۔ خطوط نگاری کو ادبی صنف کیوں کہا جاتا ہے؟

2۔ اقبال اور ندوی کے مابین مکاتبت کی فکری اہمیت بیان کریں۔

3۔ مولانا ندوی اقبال کی علمی خدمات کے کس پہلو کو سراہتے ہیں؟

4۔ اقبال کے نزدیک مغرب کی مادی ترقی سے کیا سیکھنا چاہیے؟

طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1۔ علامہ اقبال اور مولانا سلیمان ندوی کے مابین مکتوبات کے مطالعے سے ان کے فکری رشتے اور ادبی اسلوب پر روشنی ڈالیں۔

2۔ اردو ادب میں خطوط کی ادبی و تاریخی اہمیت پر مفصل نوٹ لکھیں۔

3۔ اقبال کے مکاتیب کے تناظر میں ان کے تصورِ ملت اور نشاۃ ثانیہ پر بحث کریں۔

6.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

1- ڈاکٹر نجم السحر ''مولانا ابوالکلام آزاد''

2- محمد اسحاق ''کھیل کود اور تعلیم''، مشمولہ ''تعلیم ایک تحریک، ایک چیلنج''، کل ہند تعلیمی تحریک، نئی دہلی۔
3- صالحہ عابد حسین ''سلسلہ روز و شب''، مشمولہ ''گلزار ادب (دوم) بورڈ آف انٹر میڈیٹ ایجوکیشن، حیدر آباد۔
4- "A Truely Beautiful Mind" - Beehive, Text Book in English for Class IX (NCERT)
5- "Coorg" First Flight, Text Book in English for Class X (NCERT)

اکائی 7۔ صحافتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا (حصہ اول)

(Engaging with Journalistic Writing Part-1)*

اکائی کے اجزاء

7.0 تمہید (Introduction)

7.1 مقاصد (Objectives)

7.2 متن (1) اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ٹرمپ کا خطاب

7.3 متن (2) جی ایس ٹی ملک کے محاصلی اور مالیاتی نظام کی ناکامی کی تصویر

7.4 متن (3) تدریس ایک فن ہے

7.5 متن (4) Re-imagining the OBC Quota

7.6 متن (5) The Legal Status of Animals

7.7 خلاصہ (Summary)

7.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

7.9 فرہنگ (Glossary)

7.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

7.0 تمہید (Introduction)

جیسا کہ ابتداء میں بتایا جاچکا ہے کہ اس کورس کو شامل نصاب رکھنے کا مقصد طلبا میں مطالعے کی عادت کو فروغ دینا اور مطالعہ کیے جانے والے متون کے معنی و مفہوم تک رسائی حاصل کرنا اور پھر ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ لہٰذا آپ نے پہلی اکائی میں واقعات پر مبنی متون کا مطالعہ کیا ہے اور دوسری اکائی میں مضمون پر مبنی وضاحتی متون کا مطالعہ کیا۔ اس اکائی میں آپ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے صحافتی و غیر صحافتی متون کا مطالعہ کریں گے اور پھر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

* Prof. Najmus Saher, Professor, Centre for Distance and Online Education, MANUU

7.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی میں دیے گئے متون کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ :

- اخبارات میں شائع شدہ صحافتی مضامین پڑھ کر اس کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔
- صحافتی مضامین کے مطالعے کے بعد ان پر اظہار رائے کر سکیں۔
- صحافتی و غیر صحافتی متون کے فرق کو سمجھ سکیں۔

7.2 متن(1)اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ٹرمپ کا خطاب

گزشتہ نو ماہ میں جب سے وہ امریکہ کے صدر بنے ہیں ڈونلڈ ٹرمپ نے شمالی کوریا پر متعدد بار سخت جملے استعمال کیے ہیں۔ کبھی آگ اور غیض و غضب کی نمائش کی دھمکی دی ہے تو کبھی کم جونگ ان کو ایسا سبق سکھانے کا عہد کیا جو وہ کبھی بھول نہیں سکیں گے۔ تاہم منگل کے دن ٹرمپ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں شمالی کوریا کے خلاف جارحیت اور زہر افشانی کی تمام حدیں پار کر لیں۔ یہ سچ ہے کہ شمالی کوریا کے صدر ایک ذہنی طور پر غیر متوازن جابر ڈکٹیٹر ہیں جن کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں سے ان کے پڑوسی ممالک نالاں ہیں۔ لیکن ٹرمپ نے اپنی تقریر میں صرف کم جونگ ان اور ان کی ملٹری کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ پورے شمالی کوریا اور اس کے ڈھائی کروڑ عوام کا صفحہ ہستی سے نام و نشان مٹا دینے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اقوام متحدہ کی بنیاد اس مقصد کے تحت رکھی گئی تھی کہ مستقبل میں اگر دو بارہ سے زیادہ ممالک کے درمیان کسی وجہ سے کوئی تنازع پیدا ہو تو مذاکرات کے ذریعہ اس کا مثبت حل ڈھونڈ لیا جائے تاکہ خطے میں امن قائم رہے۔ اقوام متحدہ جنگ کو ٹالنے اور بین الاقوامی تنازعوں کے سفارتی حل کی حصولیابی کا سب سے بڑا عالمی پلیٹ فارم ہے۔ ٹرمپ کے ریکارڈ کے پیش نظر یہ خدشہ تو تھا کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان کی افتتاحی تقریر بے حد تلخ ہو گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امید بھی تھی کہ شاید وہ عالمی لیڈروں کی موجودگی میں اس متانت، بردباری اور تحمل کا مظاہرہ کریں گے جو دنیا کے واحد سپر پاور کے سربراہ سے متوقع ہے۔

لیکن ٹرمپ نے بھلا پہلے کبھی کسی کی پرواہ کی تھی جو اب کرتے۔ انہوں نے شمالی کوریا کے سربراہ کم جونگ کو حقارت سے ''راکٹ مین'' کا نام دے کر کہا کہ وہ خودکشی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اور اس کے بعد ٹرمپ نے وارننگ دی کہ اگر شمالی کوریا ایٹمی تجربات اور بالسٹک میزائل کے تجربات بند نہیں کرتا تو وہ اس چھوٹے اور غریب ملک کو مکمل طور پر تباہ کر دیں گے۔

امریکہ کے معتبر اخبار واشنگٹن پوسٹ کے ایک کالم نویس کے مطابق اقوام متحدہ میں اپنی پہلی تقریر میں امریکی صدر ایک مدبر اور دانا سیاستداں کی مانند نہیں بلکہ کسی ''مافیا سرغنہ'' کے انداز میں بول رہے تھے۔ ٹرمپ شاید یہ بھول گئے تھے کہ وہ اریزونا یا کسی اور امریکی ریاست میں ریپبلکن پارٹی کے ورکرز کی ریلی سے نہیں بلکہ ایک عالمی ادارے کے اسٹیج سے پوری دنیا سے خطاب کر رہے تھے۔ نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریہ میں اسی نکتہ کو یوں اجاگر کیا:

''اقوام متحدہ وہ مقام نہیں ہے جہاں سے کوئی یہ توقع کرے کہ جنگ کی دھمکی دی جائے گی۔ تاہم

صدر ٹرمپ نے جنرل اسمبلی میں اپنی افتتاحی تقریر میں بالکل یہی کام کیا''

ایک اور امریکی اخبار تو ٹرمپ کی تقریر سے اس قدر مایوس ہوا کہ اس نے اپنے اداریہ کا یہ عنوان لگایا ''پاگل آدمی کون ہے، کم یا ٹرمپ؟''

یہاں قارئین کو یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ ٹرمپ کم جونگ کے بارے میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ پاگل شخص ہے جس کے پاس جوہری ہتھیار موجود ہیں۔ پچھلے ماہ برطانیہ کے اخبار ''دی گارجین'' میں معروف کالم نویس نک کوہین کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان ہی پوری کہانی بیان کرتا ہے:

"It takes one mad man to press the button. We have two."

جب سے ٹرمپ نے وائٹ ہاؤس میں قدم رکھا ہے تب سے امریکہ میں بھی ان کے ناقدین اور میڈیا کو اس بات کا شبہ ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہیں۔ شمالی کوریا کے کم کے بارے میں تو عالمی برادری کو یہ یقین ہے کہ ان کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ ساری دنیا کے مخالفت اور امریکہ کے سخت دباؤ کے باوجود کم بار بار بالسٹک میزائل داغ رہے ہیں۔ امریکہ کی ایما پر اقوام متحدہ نے شمالی کوریا کے خلاف پابندیاں عائد کر کے اس کی نکیلیں کسنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان سب کے باوجود کم ٹرمپ کی دھمکی کا جواب نہ صرف دھمکی سے دیتے ہیں بلکہ ہر دھمکی کے بعد پہلے سے زیادہ طاقتور میزائل اور دور تک مار کرنے والا میزائل داغ دیتے ہیں۔ امریکہ تمام تر کوششوں کے باوجود شمالی کوریا کو جوہری تجربات سے باز رہنے پر مجبور نہیں کر سکا ہے۔ پچھلے چند ہفتوں میں جاپان پر نشانہ سادھ کر پیونگ یانگ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے کہ وہ بہت جلد ایسے میزائل تیار کر لے گا جو امریکہ کے سان فرانسسکو اور سٹیل تک مار کر سکیں گے۔ واشنگٹن کو اب یہ ڈر بھی ستانے لگا ہے کہ کم گوام جزیرہ پر واقع امریکی فوجی اڈہ کو تباہ نہ کر دیں۔

ٹرمپ نے چالیس منٹ کی اپنی تقریر میں دو بار سابق امریکی صدر ہیری ٹرومین کا ذکر کیا۔ ٹرومین نے ہی دوسری جنگ عظیم کے اخیر میں 1945ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کا حکم دیا تھا۔ وہ فیصلہ بے شک انسانی تاریخ کا سب سے بڑا جنگی جرم تھا۔ ان 72 سالوں میں دنیا میں بہت سی جنگیں ہوئی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ جوہری ہتھیاروں کا استعمال کسی ملک نے نہیں کیا جبکہ آج درجن بھر ممالک کے پاس ایٹم بم موجود ہیں۔

ٹرمپ اور کم کے درمیان جو رسہ کشی جاری تھی اس میں اگست اور ستمبر مہینوں میں سنگین حد تک اضافہ ہو گیا۔ دونوں کے درمیان پہلے زبانی جنگ ہوئی اور اس کے بعد دونوں فریقین نے اپنی اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ کر کے ایک دوسرے کو اجتماعی تباہی کی دھمکیاں دے ڈالیں۔ ستمبر کے اوائل میں شمالی کوریا نے یہ اعلان کر کے ساری دنیا کو دہشت زدہ کر دیا کہ اس نے چھٹا اور اب تک کا سب سے بڑا جوہری تجربہ کر لیا ہے۔ اب پیونگ یانگ کے پاس ایک طاقتور ہائیڈروجن بم بھی ہے اور یہ صلاحیت بھی کہ وہ اسے بالسٹک میزائل کے ذریعہ ہزاروں کلو میٹر دور کسی بھی براعظم پر گرا سکتا ہے۔

واشنگٹن میں ایک ہنگامی میٹنگ کے بعد دفاعی سکریٹری جیمس میٹس نے میڈیا کے سامنے یہ اعلان کیا کہ ٹرمپ ایسی دھمکیوں کا

زبردست عسکری جواب دیں گے جو موثر اور ہمہ گیر ثابت ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکہ شمالی کوریا کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے وہ صرف وہاں حکومت تبدیل کرنے کا خواہش مند ہے۔ دس دن قبل اقوام متحدہ میں امریکی سفیر نکی ہیلی نے سیکورٹی کونسل میں شمالی کوریا کے خلاف سخت پابندیوں کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ''جنگ کے لیے بے چین ہے''۔ جبکہ ٹرمپ کی تقریر سے یہ صاف ظاہر تھا کہ امریکہ بھی جنگ کے لیے بے قرار ہے۔ یعنی امریکہ اور شمالی کوریا تیزی سے تصادم کی راہ پر بڑھ رہے ہیں۔ ڈر اس بات کا ہے کہ یہ جنگ ایٹمی جنگ کا روپ اختیار نہ کرلے۔ ٹرمپ نے اپنی تقریر میں یہ لن ترانی کی کہ امریکہ اپنی دفاعی ضروریات پر 700 ملین ڈالر خرچ کرنے والا ہے اور اس کی فوج بہت جلد مضبوط ترین فوج بن جائے گی۔ لیکن وہ یہ بات نہیں سمجھ رہے ہیں کہ خواہ ان کی ملٹری کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہو کوریا بحران پر فوجی کارروائی کے ذریعہ قابو نہیں پاسکتا۔ اگر ٹرمپ نے طاقت کے زعم میں جزیرہ نما کوریا پر حملہ کیا تو اس کے بھیانک نتائج ہوں گے۔ شمالی اور جنوبی کوریا اور جاپان کے لاکھوں بے گناہ شہری اور خطے میں تعینات امریکی افواج مارے جائیں گے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اگر جنگ ہوئی تو کم جونگ ان جوہری ہتھیار استعمال کرنے سے نہیں چوکیں گے۔

ٹرمپ کی اقوام متحدہ کی تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انہوں نے کوریا تنازع کو اپنی نااہلی اور جنگی جنون کے باعث ایک بحران میں تبدیل کردیا ہے۔ وہ امریکہ کو ایک قطعی غیر ضروری اور تباہی والے جنگ کی سمت میں ڈھکیل رہے ہیں۔ اس بحران سے نمٹنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے مذاکرات کا راستہ۔ ایک حالیہ سروے سے پتہ چلا ہے کہ 56 سے 80 فیصد امریکی عوام بات چیت کے ذریعہ اس مسئلہ کا حل چاہتے ہیں۔ پہلے بھی امریکی حکومت شمالی کوریا کے ساتھ ایٹمی تنازع کا سفارتی حل نکال چکی ہے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)
1۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اقوام متحدہ کی بنیاد کس مقصد کے تحت رکھی گئی تھی؟
2۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے ٹرمپ کی کون سی خصوصیات بتائی ہیں؟

7.3 متن (2) جی ایس ٹی ملک کے محاصلی اور مالیاتی نظام کی ناکامی کی تصویر

ایک سوال آج کل ہم سب کو جو پریشان کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ کیا مرکزی حکومت کنٹرول کھو چکی ہے؟ اور کئی محاذ پر یہ بات سچ نظر آتی ہے۔ سماجی ملبوس کو تار تار کیا جاچکا ہے اور خصوصاً ''گائے کی پٹّی'' میں اسے پوری طرح تباہ کیا جاچکا ہے۔ گائے کے محافظوں نے کئی مقامات پر قتل اور تباہی مچادی ہے اور جن پولیس والوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی ان پر حملے بھی کیے گئے ہیں۔ جن لوگوں نے وزیر اعظم اور ان کے خوشامدی ٹولے کے خلاف آوازیں بلند کیں انہیں مار اپیٹا گیا۔

تاہم سب سے فکر کی بات یہ ہے کہ حکومت نے پوری معیشت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ پیداوار گھٹ چکی ہے اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ ایندھن کے داموں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ برآمدات سست رفتار ہو رہی ہیں اور درآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ سونے کی درآمدات حالیہ عرصہ میں بڑھ چکی ہیں۔ حصص بازار (شیئر مارکیٹ) میں اچھال کی حکومت خوشیاں منا رہی ہیں مگر اب وہ بھی ڈھیر ہو رہا ہے۔ ڈالر دوبارہ تقریباً 65 روپیوں تک پہنچ چکا ہے۔ غرض تمام محاذوں کی خبریں افسوسناک ہیں۔

اس انحطاط کی متعدد وجوہات ہیں۔ بعض داخلی اسباب ہیں اور بعض دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے اثرات ہیں۔ اس کے لیے جزوی طور پر ٹرمپ انتظامیہ بھی ذمہ دار ہے کیونکہ ان کی وجہ سے سافٹ ویئر اور ماوریٰ وسائل شعبوں میں روزگار کے مواقع گھٹ گئے۔ شمالی کوریا کے ہائیڈروجن بم کے تجربہ کے خطرے نے عالمی سرمایہ کاروں میں خوف وہراس پیدا کر دیا ہے۔ خلیج کے غیر یقینی حالات کے سبب برآمدات اور ملازمتوں کا نقصان الگ ہو رہا ہے اور اس سے غیر مقیم ہندوستانی باشندوں کی جانب سے روانہ کیے جانے والے زر مبادلہ میں بھی کمی واقع ہو رہی ہے۔ مشہور معاشی ماہر جین ڈریز کے الفاظ ہیں۔ نوٹ بندی کی مثال ایسی تھی جیسے ایک تیز رفتار موٹر گاڑی کے ٹائروں پر فائر کر دیا جائے۔ اس اقدام نے معاشی رفتار کو کم کر دیا اور چھوٹی صنعتوں کے شعبہ کی کمر توڑ دی اور صارفین کے مصارف کی سطح کو گھٹا دیا جس کے نتیجہ میں اشیاء کی طلب کم ہو گئی۔

اور اب جی ایس ٹی کے نتیجہ میں ایک اور انحطاط واقع ہو رہا ہے۔ اپنی اصل شکل میں جی ایس ٹی ایک واحد، سادہ، غیر پیچیدہ ٹیکس تھا جو تمام سابق پرانے محاصلی نظام سے وابستہ الجھنوں اور بالراست نظام جو ہندوستان میں رائج تھا اس کی پیچیدگیوں کو ختم کر سکتا تھا۔

جب اس کا نفاذ عمل میں آیا تو سارے پھوڑے ابھر آئے۔ جی ایس ٹی کے نفاذ سے پتہ چلتا ہے کہ پالیسی سازی کا نظام ایک عمدہ موقع کو کس طرح ایک مصیبت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو فوری احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس مسئلہ سے نہایت ہی جنگلی پن سے نمٹا گیا۔ ریاستوں کو عملاً نئے محاصلی نظام کو قبول کرنے کے لیے دھمکایا گیا اور انہیں نشانہ بنایا گیا۔ غیر راست محاصل ہندوستانی آئین کے مطابق ریاست کی ذمہ داری ہے اور مرکز کو چاہیئے تھا کہ ریاستوں کو اس کے لیے راغب کرتا۔ اس کی وضاحت کی جاتی اور انہیں اعتماد میں لیا جاتا لیکن دستور کی ان دفعات ہی پر سوار ہو کر ریاستوں پر اسے مسلط کر دیا گیا جس سے بعض ریاستوں میں ناراضگی پھیل گئی۔

دوسرا مسئلہ یہ رہا کہ بنیادی اصولوں کو اندھا دھند نظر انداز کیا گیا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ سارے ملک کا ایک ہی قانون ہو مگر اصل میں کیا ہوا محاصل کے پانچ درجہ یا سطحیں ہو گئیں اور الکوحل اور ایندھن جی ایس ٹی کی حد سے نکل گئے۔ محاصل کی زیادہ سے زیادہ سطح 28 فیصد اور کم سے کم صفر فیصد رہی۔ محاصل کی مختلف سطحوں کا کوئی جواز نہیں پایا جاتا۔ بہت سے محصول دہندگان کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کن اجزاء پر کتنا ٹیکس ادا کریں کیونکہ شرحیں مختلف ہیں۔

تیسرا مسئلہ ٹیکس کی معافی کو سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے جو انتہائی پیچیدہ ہے اور برآمدات کے شعبہ سے کس طرح نمٹا جائے یہ ایک مسئلہ ہے۔ حکومت کو 65 ہزار کروڑ روپیوں کی واپسی کا مسئلہ بھی درپیش ہے جن لوگوں کے محاصل ادا کر دیئے گئے ہیں ان کی وجہ سے برآمد کنندگان کو نقدی کی قلت کا سامنا ہے۔ ایسی صورتحال میں جس میں برآمدات میں رکاوٹ واقع ہو چکی ہے اور وہ سست رفتار ہو چکی ہیں جو حکومت کے لیے ایک اور دھکا ہے۔

جی ایس ٹی کے نفاذ سے قبل ٹکنالوجی اور اساسی ڈھانچہ جو سکون میں تھے ان میں بھی بدنظمی پیدا ہو گئی ہے۔ وزیر مالیات نے ٹیکس بھرنے والوں سے اپیل کی ہے کہ وہ آخری دن ٹیکس زیادہ تعداد میں نہ بھریں کیونکہ ٹکنالوجی کی کمر یہ بوجھ برداشت نہ کر سکے گی اور ٹوٹ جائے گی۔ انہوں نے یہ بات اس وقت کہی جب ای ایس ٹی کے نیٹ ورک صرف 85 لاکھ اداروں تک محدود پائے گئے اور یہ جملہ ٹیکس دہندگان کے 50 فیصد سے بھی کم ہیں اور ان کا تعلق ماہانہ تختہ جات بھرنے والوں سے ہے۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)
1۔ جی ایس ٹی کے نفاذ سے کون سے مسائل پیش آرہے ہیں؟ تبصرہ کیجیے۔
2۔ ہندوستانی مالیاتی نظام کی خوبیوں اور خامیوں پر اپنے گروپ میں بحث (Discuss) کیجیے۔

7.4 متن (3) تدریس ایک فن ہے (Teaching is an Art)

کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ (1964-66) کا پہلا جملہ یوں شروع ہوتا ہے۔" The Destiny of India is now being shaped in her class rooms." ہندوستان کی تقدیر کی تشکیل اب اس کے کمرہ جماعت میں ہو رہی ہے۔ یہ جملہ بہت معنی خیز ہے۔ اس رپورٹ کے تیار کرنے والوں نے بہت گہری اور بنیادی بات پر انگلی رکھ دی ہے۔ اس ایک جملہ کی تشریح کے لیے انہیں ایک ہزار صفحات کی رپورٹ تیار کرنی پڑی۔ آزاد ہندوستان کی تعلیمی، معاشی، سماجی، فنی، سائنسی، جمہوری نظام کی تعلیم و تربیت ان ہی کلاس رومس میں ہو گی۔

پڑھانے سے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ ہر وہ شخص بچوں کو پڑھا سکتا ہے جو بچہ کی معلومات سے چند قدم آگے ہوتا ہے بچہ کو سیکھنا ہوتا ہے اور معلم کو پڑھانا، پڑھانے میں کیا پڑھانا، کب پڑھانا اور کیسے پڑھانا، یہ چاروں باتیں اہم ہیں۔ کیا پڑھانے کے لیے سبق کا مواد اور تیاری ضروری ہے۔ کب پڑھانے کے لیے اسکول کا ٹائم ٹیبل بتادے گا۔ کس کو پڑھانا ہے؟ بچوں کو، کس عمر کے ہیں، کس قابلیت کے ہیں، کس ماحول سے آرہے ہیں، ان کی کمزوریاں کیا ہیں اور ان کی صلاحیت کا معیار کیا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ استاد کو نہ صرف یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس کو کیا پڑھانا ہے، اس مضمون پر اسے کتنا عبور ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بچہ کو جاننا، پہچاننا اس سے، بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر وہ بچہ یہ طالب علم کو پوری طرح نہیں جانتا تو اس کی بہت سی محنت رائیگاں جائے گی۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ، غصہ اور سزا جھلاہٹ سے خود استاد کی خامیوں کو عیاں کرتی ہیں۔

اصل سوال کیسے پڑھانے کا ہے یہی سوال اس مضمون کی جان ہے۔ اکثر ٹیچر پڑھاتے نہیں وہ صرف نصاب کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ ذاکر حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آج کل تعلیم کہاں دی جاتی ہے۔ ٹیچر کی نوٹ بک سے طلبہ کے نوٹ بک میں منتقل ہو جاتی ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے لکھا ہے کہ تعلیم کوئی ایسا عمل نہیں جیسے کسی نے پانی ایک بکٹ سے دوسری بکٹ میں انڈیل دیا ہو۔ جب تک تعلیم یا سیکھنے کا عمل Learning Process طلبہ کے ذہن و دماغ بلکہ روح کے واسطوں سے نہ ہو وہ تعلیم نہیں ہو پاتی۔

دینی درسگاہوں میں زیادہ تر بجائے غور و فکر، ذہن اور دماغ پر بار ڈالنے کے رٹنے پر زور دیا جاتا ہے۔ یہاں پر رٹو حافظہ کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ رٹنے کے لیے کسی بات کو بار بار پڑھنا اور دہرانا ضروری ہوتا ہے لیکن یہاں تعلیم کا عمل کم رہ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کوئی تعلیمی سند تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان میں وہ دانشوری پیدا نہیں ہوتی جو کسی عالم دین کی شان ہوتی ہے۔

Chalk and Talk Method of Teaching بات اور چاک پیس کے استعمال کا طریقہ بھی اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جدید سائنٹفک طریقہ ہائے تدریس اس قابل ہیں کہ انہیں کلاس رومس میں جلد از جلد اپنا لیا جائے۔

کلاس روم کی تعلیم میں اصل لین دین، سوال جواب، طلبہ میں سوچنے، سمجھنے اور حقیقت کے انکشاف کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ اسی ترکیب سے ان میں تعلیم کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔ یہی اصل میں تعلیم کا جوہر ہے یا Essence of Teaching ہے۔ جیسا ہر فن کے سیکھنے کے بعد اس علم کو معروضی حالات پر منطبق کرنے، صحیح نتائج حاصل کرنے اور اس کی معنویت کو پانے کے لیے Internship ضروری ہے۔ اسی طرح ہر ٹیچر کے لیے عملی لیبارٹری۔ یعنی کلاس روم میں انہیں آزمانے کی ضرورت ہے۔ کسی ٹیچر یا پروفیسر کا کمال یہ نہیں کہ وہ اپنے مضمون کا کتنا بڑا ماہر ہے بلکہ اس کا اصل کمال یہ ہے کہ اس نے خود اپنے جیسے کتنے باکمال شاگرد پیدا کیے ہیں۔ ان میں وہ جستجو اور علم کا ذوق کمال حاصل کرنے کے لیے انہیں کن کن تدابیر سے سنوارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرائمری سے لے کر گرایجویشن سطح تک کوئی ساٹھ ستر اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ لیکن وہ طالب علم ان تمام میں صرف دو چار ٹیچرس کو ہی یاد رکھتا ہے جنہوں نے سچ مچ اس کی تعلیم و تربیت میں بلکہ اس کی شخصیت میں کچھ ایسا گارا اور چونا بھر دیا جس کی تفصیل اور تشریح بیان سے قاصر ہے۔

بچوں کا معیار تعلیم وہ نہیں ہے جو عہدیدار یا انتظامیہ انسپکشن کے وقت معلوم کرتے ہیں۔ وہ معیار پچھلے برسوں کی تعلیم کے نتیجے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اصل معیار تعلیم ہر ٹیچر کا وہ جذبہ اور لگن ہے جو وہ اپنے طلبہ میں تعلیم سے متعلق پیدا کرتے ہیں۔ اگر سب اساتذہ میں یہی جذبہ پیشہ میں کارفرما ہے تو پھر یہ اجتماعی شکل میں بچوں کے معیار تعلیم میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ خود اس معیار کے لیے اساتذہ کی تعلیم و تربیت، تجربہ اور جذبہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ہر تعلیم ایک تجربہ اور ہر تجربہ کچھ نہ کچھ سکھا دیتا ہے۔ اسی سیکھنے کی رفتار سے بچہ کی شخصیت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ شخصیت کی تشکیل، جسم و جان۔ ذہن و دماغ پر ہزاروں عوامل کے اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ سیکھنے، سمجھنے اور سوچنے کے دوران بچہ کے کردار، سمجھ بوجھ اور برتاؤ میں عظیم تبدیلیاں لانے کے بعد شخصیت کا ایک نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے جس میں اعتدال، توازن، اپنی ذات پر بھروسہ یا خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک اچھے آرٹسٹ کی تخلیق آرٹ کا ایک نمونہ ہوتی ہے۔ ایک اچھے ٹیچر کا ہر سبق کا ایک فن پارہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی ٹیچر اس معیار پر اتر جائے تو وہ بھی ایک بڑا آرٹسٹ ہے۔ اس کی کسوٹی یہ ہے کہ ایک پوشیدہ مسرت سے بچوں کے چہرے دمک اٹھیں ان کے دل میں ٹیچر کی عزت و عظمت پیدا ہو جائے اس احساس سے ٹیچر کو جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ خود اس کا انعام ہے جو کسی انعام اور تعریف کا محتاج نہیں۔ بچہ کی تعلیم و تربیت اور شخصیت کی تعمیر کا زمانہ دنیا کی ساری مخلوقات میں طویل ترین زمانہ ہے یہی وجہ ہے کہ جس آرٹ کے نمونہ کی تخلیق مقصود ہے وہ دنیا کے ساری مخلوقات میں طویل ترین زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس آرٹ کے نمونہ کی تخلیق مقصود ہے وہ دنیا کے سارے فنون میں سب سے اعلیٰ ترین اور مشکل ترین فن ہے جو مختلف عوامل کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ اثر انداز ہونے والا عامل کلاس روم کی تدریس، ٹیچر کی شخصیت اور اس کے پڑھانے کا موثر انداز ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

یہ خون جگر دراصل اپنے پیشہ اور فن سے عشق یا خلوص کا نام ہے جس کی کرامات بے حساب ہیں۔

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں (Check Your Progress)
1۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے تدریس کو کیوں فن قرار دیا ہے؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
2۔ استاد اور آرٹسٹ میں کیا مماثلت پائی جاتی ہے؟ بیان کیجیے۔

7.5 متن (4) Re-imagining the OBC Quota

Sub-categorization of OBCs provides an opening to ensure social justice works better Regardless of the political impulse that led the government to announce creation of a committee to look into sub-categorization of Other Backward Classes (OBC), it provides an opening to ensure social justice in an efficient manner. The biggest challenge India faces is that the groups perceived to be disadvantaged consist of a very large segment of Indian society, while public policies are highly limited in scope.

The Jobs-claimants mismatch

Some illustrative statistics are eye-opening. The National Sample Survey (NSS) data from 2011-12 show that about 19% of the sample claims to be Dalit, 9% Adivasi, and 44% OBC. While some of these claims may be aspirational rather than real, this totals a whopping 72%. Among the population aged 25-49, less than 7% have a college degree. By most estimates, less than 3% of the whole population is employed in government and public-sector jobs. Since reservations cover only half the college seats and public-sector jobs, the mismatch is obvious. A vast proporation of the population eligible for reservations must still compete for a tiny number of reserved and non-reserved category jobs. It is not surprising that there is tremendous internal competition within groups.

If we want reservations to make a significant difference in the lives of the marginalized groups, there are only two options. Either the government

must drastically increase availability of government jobs and college seats or it must reduce the size of the population eligible for these benefits. While the Supreme Court would not allow reservations to exceed 50%, frankly it does not matter. Whether available public sector jobs cover 1.5% of the population or 3%, these will only offer opportunities to a minuscule fraction of individuals in reserved categories. Hence, the only viable option is to reduce the size of the eligible population, possibly along the lines of sub-categorization proposed by the government.

However, while the media and claimants to the coveted OBC status such as Jats, Kapus and Patels are busy arguing over the merits of this proposal, very little attention is paid to the practical challenges facing sub-categorization. How will we know which castes are the most disadvantaged? At the moment, the only reputable nationwide data on caste comes from the 1931 colonial Census and some of the ad hoc surveys conducted for specific castes.

Lack of Credible data

The Socio-Economic Caste Census (SECC) of 2011 was supposed to provide up-to-date comprehensive data. However, the results remain shrouded in mystery. When releasing poverty and deprivation data from the SECC in 2015, it was found that about 4.6 million distinct caste names, including names of gotra, surname and phonetic variations were returned, making the results almost impossible to interpret. For nearly 80 million individuals, caste data were believed to be erroneous. Since then we have heard little about the quality of caste data in SECC and even less about its results. In 2015, the then NITI Aayog Vice Chairperson, Arvind Panagariya, was asked to head a committee to chair the caste classification using SECC

data. Little seems to have come of it.

It is not surprising that SECC data have not been able to shed light on socio-economic disadvantages faced by different caste groups: addition of caste information was an ill-conceived graft on what was supposed to be a Below Poverty Line (BPL) survey. This patchwork solution had to be adopted because in spite of wide-spread demands to include caste data in the Census of 2001 and 2011, the Office of the Registrar General was reluctant to add this burden to the decennial exercise. As a way of appeasing the OBC lobby, it was decided that the BPL census would incorporate caste information.

After the probable failure of this effort, it would make sense to rethink collection of caste data in Census. Preparations for Census 2021 are ongoing. There is still time to create an expert group to evaluate the methodology for collecting caste data and include it in the Census forms. Losing this opportunity would leave us hanging for another 10 years without good data for undertaking sub-categorization of OBC quota or evaluating claims to OBC status by groups like Jats and Patels.

Address caste-based inequalities

A broader issue, however, focuses on whether we want to radically rethink our approach to affirmative action. What would it take to eliminate caste-based disadvantages in next three or four decades? A two-pronged approach that focuses on eliminating discrimination and expanding the proportion of population among the disadvantaged groups that benefits from affirmative action policies could be a solution.

The present policies focus on preferential admission to colleges and coveted institutions like IITs and IIMs. But these benefits may come too late

in the life of a Kurmi or Gujjar child. Their disadvantage begins in early childhood and grows progressively at higher levels of education. The India Human Development Survey of 2011-12 found that among families where no adult has completed more than Class X, 59% children from the forward castes are able to read a simple paragraph while the proportion is only 48% for OBCs, 41% for Dalits and 35% for Adivasis. We know little about what goes on in schools to create these disadvantages but improving quality of education for all, including those from marginalized groups, must be a first step in addressing caste-based inequalities.

Check Your Progress
1. According to the writer, why there is a need for sub-categorization of OBC's?
2. Discuss the present scenario of reservation policy in India in your group.

7.6 متن The Legal Status of Animals(5)

The monkey selfie case has come to an end, but questions remain unanswered

In 2015, a lawsuit brought by People for the Ethical Treatment of Animals (PETA) claimed that Naruto, an Indonesian crested black macaque, should be entitled to the rights of a self-portrait which the animal had accidentally clicked with the camera of David Slater, a nature photographer. In 2016, a federal court in San Francisco held that while protection under the law may be extended to animals, the same could not be said of copyright laws in which lie vested rights and ownership. PETA's legal team said it would appeal the decision. Fortunately, on September 12, 2017, both the parties

decided to settle the matter, with Mr. Slater agreeing to donate 25% of any future revenue from Naruto's images to charities dedicated to the conservation of crested macaques in Indonesia.

This dispute once again gave rise to questions about the legal personality of non-humans.

The 21st century has seen many attempts to recognize animals as legal subjects - from granting them protection from cruel treatment, to arguments for recognizing them as legal persons and granting them property rights - but there has been discomfort in giving them a plenary membership within the human legal community. Scholars like Benjamin Berger have argued that it is the contrived attempt to treat humans and animals similarly that has obscured our understanding of animals as legal subjects, while moral philosopher Peter Singer contends that the idea of the species divide itself is feigned, and so the moral and legal distinction irrelevant.

A legal personality is usually defined as a subject vested with rights and duties. However, within the parameters of law, it has never been confined to human beings and has even included idols and companies. Strangely, though, the same rationale has failed in courts in its application to animals because of the imaginary distinction between the multitude of species, and their inability to carry on legal duties.

Conversations around 'legal personhood' have often been marred by the uncharacteristic merging of 'justice' with 'rights'. The moral and ethical undertones of 'animal justice' are largely absent in the arguments around 'animal rights'. Further, rights can be broken down into formal and substantive rights. The right to appear before the court and plead is different from the right to integrity and equal protection under the law. It is not to say

that one has to choose between the two; both are integral to the definition of rights.

The federal court in the Naruto case has merely mirrored the premise that animals can only be objects or properties, but questions regarding the legal standing or legal personality of non-human persons remain unanswered. Ironically, the imperative of granting legal recognition through legal personality reveals both the obscurity and absurdity of extending identities to animals. Even if the courts were to accept limited personhood, we are still left with the reality that the process of recognition is confined to our communities and legal structures. The notion of autonomy and agency of animals will continue to fail. However, the case has pushed us to think over uncharted territories of human/non-human subjectivity in law.

Check Your Progress	
1.	What do you know about the monkey's selfie case?
2.	Why animals are recognized as legal subjects.

7.7 خلاصہ (Summary)

اس اکائی کا بنیادی مقصد طلبہ میں مطالعہ کی عادت کو فروغ دینا، مختلف متون کے مفہوم کو سمجھنے اور ان پر اظہارِ خیال کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ اس میں چار متنوع مضامین شامل ہیں جن میں مختلف فکری، تعلیمی اور سماجی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلا مضمون "اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ٹرمپ کا خطاب" عالمی امن، جوہری خطرات اور امریکی خارجہ پالیسی کے جارحانہ رویے پر تبصرہ کرتا ہے۔ دوسرا مضمون "جی ایس ٹی: مالیاتی نظام کی ناکامی کی تصویر" معاشی پالیسیوں کی خامیوں، ریاستی تعلقات اور ٹیکس نظام کے عملی مسائل کو واضح کرتا ہے۔ تیسرا مضمون "تدریس ایک فن ہے (Teaching is an Art)" تدریس کو ایک فن قرار دیتے ہوئے استاد کے کردار، جذباتی وابستگی، تخلیقی تدریس، اور جدید تدریسی طریقوں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ چوتھا مضمون "Re-imagining the OBC Quota" سماجی انصاف کے تصور میں بہتری، ذات پات کی درجہ بندی، قابلِ اعتماد اعداد و شمار کی کمی، اور موجودہ سماجی پالیسیوں کے چیلنجز پر روشنی ڈالتا ہے۔ مجموعی طور پر، یہ اکائی طلبہ کو صحافتی و غیر صحافتی متون کے فرق کو سمجھنے، تجزیاتی و تنقیدی سوچ کو فروغ دینے، اور عصری مسائل پر بامعنی مکالمہ کرنے کی تربیت فراہم کرتی ہے۔

7.8 اکتسابی نتائج(Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ درج ذیل صلاحیتیں حاصل کریں گے:

- اخباری و صحافتی متون کے مفہوم اور نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں گے۔
- عالمی و قومی مسائل پر تنقیدی تجزیہ پیش کر سکیں گے۔
- تدریس کو بطور فن سمجھتے ہوئے استاد کے کردار اور تخلیقی تدریس کی اہمیت کو جان سکیں گے۔
- جی ایس ٹی جیسے معاشی اصلاحات کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کر سکیں گے۔
- سماجی انصاف (Social Justice) اور ذات پات کی درجہ بندی کے چیلنجز کو سمجھ سکیں گے۔
- مختلف اصنافِ نثر کا تقابلی مطالعہ اور اظہارِ رائے کی مشق کر سکیں گے۔

7.9 فرہنگ(Glossary)

غیض وغضب : غصہ

متانت : استحکام، پختگی، سنجیدگی

بردباری : بوجھ اٹھانا، برداشت کرنا، سنجیدگی

حقارت : بے آبروئی، بے عزتی

عسکریت : جنگ پسندی

جی ایس ٹی : گوڈس اینڈ سروس ٹیکس

Chalk and Talk Method of Teaching : بات اور چاک پیس کے استعمال کے ذریعے تدریس

خشت وسنگ : اینٹ و پتھر

preferential: ترجیحی، رعایتی

7.10 نمونہ امتحانی سوالات(Model Examination Questions)

معروضی جوابات کے حامل سوالات(Objective Type Questions)

1۔ اقوام متحدہ کی بنیاد کن مقاصد کے لیے رکھی گئی تھی؟

(a) عالمی تجارت کو فروغ دینا (b) بین الاقوامی امن قائم رکھنا

(c) امریکی پالیسیوں کی تائید کرنا (d) فوجی طاقت بڑھانا

2۔ جی ایس ٹی کے نفاذ کے نتیجے میں سب سے بڑا مسئلہ کیا پیدا ہوا؟

(a) پیداوار میں اضافہ (b) ٹیکس نظام میں پیچیدگی

(c) روزگار کے مواقع بڑھ گئے (d) برآمدات میں اضافہ ہوا

3۔ "The Destiny of India is now being shaped in her classrooms" یہ قول کس کمیشن کا ہے؟

(a) سریش چندر کمیشن (b) کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن

(c) نیول کمیشن (d) رمیش ورما کمیشن

4۔ Chalk and talk طریقۂ تدریس کو کیوں فرسودہ کہا گیا ہے؟

(a) کیونکہ اس میں جدید ٹیکنالوجی شامل نہیں (b) کیونکہ یہ مہنگا طریقہ ہے

(c) کیونکہ طلبہ اس میں دلچسپی نہیں لیتے (d) کیونکہ یہ صرف دینی تعلیم کے لیے موزوں ہے

5۔ SECC 2011 میں ذات پات سے متعلق ڈیٹا ناقابل اعتماد کیوں قرار دیا گیا؟

(a) کیونکہ ڈیٹا بہت کم تھا (b) کیونکہ ذاتوں کے نام غیر واضح اور متضاد تھے

(c) کیونکہ مردم شماری مکمل نہیں ہوئی (d) کیونکہ حکومت نے شائع نہیں کیا

مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1۔ ٹرمپ کے اقوام متحدہ کے خطاب پر عالمی میڈیا کا ردِ عمل کیا تھا؟

2۔ جی ایس ٹی کے نفاذ میں ریاستوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

3۔ مضمون نگار کے مطابق ایک اچھے استاد کی خصوصیات کیا ہیں؟

4۔ OBC sub-categorization کے حوالے سے سب سے بڑا چیلنج کیا ہے؟

5۔ تدریس کو فن کہنے کے پسِ پشت کون سے عوامل کارفرما ہیں؟

طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1۔ مضمون "اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ٹرمپ کا خطاب " کی روشنی میں عالمی امن کے چیلنجز پر تبصرہ کیجیے۔

2۔ مضمون "جی ایس ٹی ملک کے محاصلی نظام کی ناکامی " میں دیے گئے دلائل کی روشنی میں ہندوستان کی معاشی صورتحال پر تنقیدی تجزیہ پیش کیجیے۔

3۔ مضمون "تدریس ایک فن ہے " کے حوالے سے تعلیم وتدریس کے موجودہ رجحانات پر روشنی ڈالئے۔

4۔ مضمون "Re-imagining the OBC Quota" کی روشنی میں سماجی انصاف کے موجودہ نظام کی خامیوں پر بحث کیجیے۔

5۔ اکائی کے تمام متون کے مطالعے کی بنیاد پر صحافتی و غیر صحافتی نثر کے فرق اور اہمیت پر جامع مضمون لکھیے۔

7.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

1۔ Sonalde Desai "Re imagining the OBC Quota", The Hindu, September 19, 2017

2۔ Sakshi "The Legal Statue of Animals" The Hindu, September 19, 2017

3۔ پرویز حفیظ ''اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ٹرمپ کا خطاب'' روزنامہ اعتماد۔

اکائی 8۔ صحافتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا (حصہ دوم)

(Engaging with Journalistic Writing Part-2)*

اکائی کے اجزاء

8.0 تمہید (Introduction)

8.1 مقاصد (Objectives)

8.2 متن (1) Let's Fight Terror Together

8.3 متن (2) Philosophy, Education and Their Inter-Dependence

8.4 متن (3) Rural Development and Poverty Eradication

8.5 متن (4) Global Warming

8.6 متن (5) My Greatest Olympic Prize

8.7 خلاصہ (Summary)

8.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

8.9 فرہنگ (Glossary)

8.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

8.0 تمہید (Introduction)

اس بلاک کی یہ آخری اکائی ہے۔ پچھلی سات اکائیوں میں آپ نے مختلف متون کا مطالعہ کیا اور پھر ان متون پر تحریری اور زبانی دونوں طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ اکائی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

اس اکائی میں آپ کو مطالعہ کے لیے انگریزی کے پانچ متون دیئے گئے ہیں۔ جو تمام تر اخبارات و جرائد سے منتخب کیے گئے ہیں۔ آپ سے امید کی جاتی ہے کہ دیئے گئے متون کے مطالعہ سے آپ کے اندر اظہاری صلاحیت میں بہتری پیدا ہو گی۔

* Prof. Najmus Saher, Professor, Centre for Distance and Online Education, MANUU

8.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ

- انگریزی زبان کے مختلف اسلیب سے واقف ہو سکیں۔
- انگریزی زبان کے الفاظ و تراکیب اور نحوی ساخت کو سمجھ سکیں۔
- متن کو تفہیم کے ساتھ ساتھ ان پر تنقیدی رائے کے قابل ہو سکیں۔

8.2 متن(۱)Let's Fight Terror Together

Special Correspondent

New Delhi: Prime Minister Manmohan Singh on Thursday asked the members of the South Asian Association for Regional Cooperation to fight terrorism together.

"We have a collective stake in ensuring peace and security in the SAARC region because no investor will come to this region if there is no assurance of peace and security," he said, inaugurating the first SAARC Business Leaders' Conclave here.

"To imagine that anyone of us can pursue what economists call 'beggar-thy-neighbor' policies and thereby prosper is to delude oneself," Dr. Singh said, underlining that the SAARC business community had a vital stake in regional security and in victory in the war on terror.

"We must join hand to put our collective house in order as peace in the region will benefit all. Terrorism anywhere will hurt us all," he said. Business and trade would flourish in a secure environment.

"Terrorism by whatever name, has no place in civilized societies and its basic goal is to cause insecurity," Dr. Singh said.

In an interconnected region and a globalized world, the consequences of both poverty and insecurity were indivisible. "No country in this region

can be secure when others are insecure and no country can insulate itself from the consequences of poverty and terrorism in any other country".

As envisioned at the 13th SAARC summit, the member countries would forge stronger links on the basis of renewed people-to-people ties, to help strengthen the region-wide partnership for prosperity, he said.

The Prime Minister allayed fears that free trade agreement could hurt smaller countries and called upon the SAARC leaders to move rapidly to meet the deadline for the South Asian Free Trade Agreement (SAFTA).

Dr. Singh said the need for implementing SAFTA could not be overemphasized. It was expected that its implementation would enhance trade in the region to $ 14 billion from $ 6 billion in the next two years.

Citing the high growth of bilateral trade between India and Sri Lanka, he said it dispelled fears on both sides that free trade would hurt business in smaller countries.

"This free trade agreement is a win-win agreement for both the countries and could be a model for similar agreements in the region," he said.

The Prime Minister hoped that the free trade agreement would help move towards the eventual goal of the South Asian Economic Union. "I do believe that just as regional integration is not antithetical to globalization, it also does not hurt the broader interest of any member of a regional group".

Dr. Singh said all the member states were committed to an early resolution of outstanding issues under SAFTA and hoped that the ongoing negotiations would ensure that it was operationalized from January 1 next.

He also focused on the need for expanding the ambit of SAFTA to include trade in services, in addition to widening the scope of trade in goods, for it to emerge as an effective vehicle for growth and regional integration.

Voicing his concern that SAARC had not succeeded in exploiting the immense economic potential of the region, he said that even after two decades, "Intra-SAARC exports are a mere five per cent of the total exports of the region. By comparison intra-E.U. exports are 55.2 per cent, intra-NAFTA exports are 51.7 per cent and intra-ASEAN exports are 20.4 per cent".

Noting that misgivings among corporate entities in each of the member-countries were not rooted in reality and spread out among businessmen, the Prime Minister said change required adaptation and movement from status quo.

Dr. Singh laid emphasis on stepping up investments in the region to build infrastructure and said that as a first step, India had on a reciprocal basis announced measures to move towards an open skies regime and was working for greater liberalization of the visa regime to benefit all areas of cooperative interaction.

India decided to increase the number of visas to leading businessmen of SAARC states; he said and urged the member-nations to extend transit facilities to third countries. This would help to connect the region to the ongoing economic miracle in Southeast and East Asia.

He termed the recent SAARC summit in Dhaka a milestone, saying it showed the continuing relevance of the group.

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check Your Progress)

1۔ Where was this speech delivered?

2۔ What did Dr. Singh say about Terrorism?

_____

_____

8.3 متن(۲) Philosophy, Education and Their Inter-Dependence

The inter-dependence of philosophy and education is clearly seen from the fact that the great philosophers of all times have also been great educators and their philosophy is reflected in their educational systems. This inter-dependence can be better understood by analyzing the implications of philosophical principles in the field of education. Before analyzing the educational implications of general philosophy, we should know the concept of "Philosophy" and "Education". Each one of us has a personal philosophy, which we apply consciously and unconsciously in our daily life. Each philosophy reflects a unique view of what is good and what is important. In this sense, philosophy is the system of beliefs about life. The literal meaning of philosophy is the love of wisdom which is derived from the Greek word "Philos" (Love) and "Sophia" (Wisdom). Wisdom does not merely mean knowledge. It is a continuous seeking of insight into basic realities - the physical world, life, mind, society, knowledge and values.

Education does not mean mere schooling. To become educated is to learn to become a person. Etymologically, 'education' is derived from "educare" which means 'to lead out' or "to draw out". In a broad sense, education refers to an act or experience that has a formative effect on the mind, character or physical ability of an individual. Education in this sense never ends, we truly learn from experience throughout our lives. Education and philosophy are inseparable because the ends of education are the ends of philosophy i.e. wisdom; and the means of philosophy is the means of education i.e. inquiry, which alone can lead to wisdom. Any separation of philosophy and education inhibits inquiry and frustrates wisdom.

Education involves both the world of ideas and the world of practical activity; good ideas can lead to good practice and good practices reinforce good ideas. In order to behave intelligently in the educational process, education needs direction and guidance, which philosophy can provide. Hence, philosophy is not only a professional tool for the educator but also a way of improving the quality of life because it helps us to gain a wider and deeper perspective on human existence and the world around us.

The chief task of philosophy is to determine what constitutes good life whereas the main task of education is how to make life worth living. So philosophy and education are mutually re-constructive. They give and take from each other. Philosophy deals with the goals and essentials of good life while education provides the means to achieve those goals of good life. In this sense philosophy of education is a distinct but not a separate discipline. It takes its contents from education and its methods from philosophy. The process of philosophizing about education requires an understanding of education and its problems. Hence, we can say that philosophy of education is the application of philosophical ideas to educational problems. It is not only a way of looking at ideas but also of how to use them in the best way. Therefore, it can be said that philosophy is the theory while education is the practice. Practice unguided by theory is aimless, inconsistent and inefficient just as theory which is not ultimately translatable into practice is useless and confusing. In the words of Ross "philosophy is the contemplative side while education is the active side". Philosophy deals with the ends while education deals with the means and techniques of achieving those means. Educational philosophy depends on formal philosophy, because most of the major problems of education are in fact philosophical problems. Like general

philosophy, educational philosophy is speculative, prescriptive, critical or analytic.

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check your progress)
1۔ How can you say that Philosophy and Education are interdependent on each other?
2۔ "Philosophy is the system of beliefs about life" Justify.
3۔ What is the chief task of Philosophy?

8.4 متن(۳)

Ghalib is universally acknowledged to be one of the giants of Indian literature and can truly be considered as precursor of Indian renaissance. His poetry depicts the best, the most serene and the most exalted emotions of the humanity in general. It also creates human characters which have the courage of conviction to stand up to society, the powers that be and above all the God.

Mirza Ghalib was born on 27th December, 1797 in a prosperous family of Akbarabad (Agra). During the reign of Shah Alam, his grandfather was granted the area of Pehnasu as Jagir. His maternal grandfather was having several villages in his Jagir. His father Mirza Abdullah Baig Khan was a swordsman par excellence. For a long time, he served under the rulers of Lucknow and Hyderabad and later he joined the army of Bakhtawar Singh, the Raja of Alwar and was killed in a battle while fighting for him. Mirza Abdullah Baig Khan had two sons, Mirza Asadullah Khan and Mirza Yusuf Khan and a daughter, Chhoti Khanam.

Mirza Asadullah Khan (later known as 'Ghalib') was the eldest. When Ghalib was of five, his father left for heavenly abode. So, his uncle, Mirza

Naseerullah Baig, the Subedar of Agra took him under his care. Unfortunately, his uncle also died, when Ghalib was nine years old. Thus, he was sent to his maternal grandfather's house who owned substantial property in Agra. In recognition of meritorious, services, rendered by late Mirza Naseerullah Baig, his heirs were awarded pension from the government in which Ghalib's share was seven hundred rupees annually. This pension was stopped after the Sepoy Mutiny of 1857.

At the age of thirteen, Ghalib was married to Umrao Jan Begum, the daughter of a Nawab of Delhi, named Illahi Bakhsh Khan 'Maroof". After his marriage, Ghalib settled in Delhi permanently and was popularly known as 'Mirza Naushah'. Legend has it that he was one of the most handsome youth of Delhi of his time.

Traditionally, Ghalib belonged to a family of warriors, but he earned his name and fame through his writings. He had a flair for poetry since his childhood and started writing poems when he was barely tweleve years old. In the beginning, he followed the poetic style of 'Bedil'. He himself writes, since the age of fifteen, I have been writing prose and poetry just the way the angel and devil note over deeds and misdeeds (Letter to Qadar Bilgrami). At another place, he writes "I started writing at the age of fifteen and wrote whatever came to my mind upto the age of twenty-five. In ten years, it piled up to a collection. Finally, when realization dawned upon me, I threw away may entire writings except for ten or fifteen couplets to retain as a specimen of my early writings for the present collection" (Letter to Abdur Razzaq 'Shakir’.)

Though Ghalib came to Delhi from Akbarabad but had no permanent source of income except the government pension. In a sense, this income

was sufficient for any person with moderate living standard but his aristocratic way of life found it insufficient. It was very difficult for him to change his extravagant way of life. To add to this, his wife also belonged to a benevolent Nawab family like that of Ilahi Bakhsh. Thus, it was very natural; his pension was grossly inadequate to meet their ends. His younger brother, who came with him to Delhi and was very dear to him, suffered bouts of insanity and Ghalib had to bear the burden of responsibilities as well.

While struggling with the complexities of proverbial poverty trap, Ghalib was told that he was not getting the full pension from the government, which was rightfully his. So, he went to Calcutta to file a suit regarding his pension and stayed there for two years. But his efforts bore no fruits.

An often-quoted incident bears testimony to his characteristic egoistic nature, his self-esteem and the feudal etiquette, which was so dear to him. It is said that on hearing about Ghalib's intellectual capabilities and his legendary command over Persian language, James Thomson, Secretary to British government at that time decided to appoint him as a teacher of Persian in Delhi College. He invited Ghalib at his residence for this appointment. Ghalib went to his bungalow in a Palki and sent the message about his arrival. Thomson immediately sent the word to let him in. But Ghalib remained at the gate in a hope that Saheb himself would come to receive him personally. Knowing the situation, James Thomson came out and explained that a Ghalib had come there for a job; the protocol of the Governor's Durbar did not apply to him. Ghalib said that he was under the impression that the government's job would add to his stature, but it was contrary to his expectations. Thomson argued that he was bound by the procedures. To

which Ghalib replied that in this case, he must be excused from this service. By saying this, he turned down the lucrative job of one hundred rupees per month.

Mirza Ghalib lived in an epoch, which was full of strife and political uncertainties. British influence was systematically increasing and the great Mugal power was on the verge of imminent collapse.

The last Mughal emperor, Bahadur Shah Zafar was a leading poet and patron of art and literature. He entrusted Mirza Ghalib upon the responsibility of writing the history of Mughal dynasty and gave him tiltles of 'Najmuddaulah', 'Debeerul Mulk' and 'Nizam-e-Jung' and also fixed a monthly stipend for him. The first volume of this history entitled, 'Mehr-e-Neemroz' was published in 1857. In the same year, famous poet Sheikh Ibrahim 'Zauq' who was the emperor's mentor for his poetry and was known as 'Ustad-e-Sheh (King's teacher) died. After his death, this position was also awarded to Ghalib. But the second volume of this history for which Ghalib had proposed the name, 'Mah-e-Neem Mah' could not be written due to the changing political scenario. And then the simmering revolution of 1857 erupted, during which the world-famous city of Delhi became 'deceased Delhi' in the words of 'Hali'. Ghalib was then at sixty.

The resulting chaos in the aftermath of the struggle of 1857 posed repeated tragic losses to Ghalib, like the stipend from Durbar of Bahadur Shah Zafar was stopped, his pension stopped due to his closeness with the emperor. So, he had to bear the brunt of unending poverty and the horror of a bleak future ahead. His miseries were compounded, when there was massacre and bloodbath everywhere after conquest of Delhi by the rampaging British troops. His wife's ornaments and other family valuables

were buried in a safe place that after normalcy these could be retrieved. But the victorious sepoys found the treasure and took away everything.

During this interregnum his younger brother Mirza Yusuf died and the grief- stricken Ghalib could not even attend the funeral due to the incessant bloodbath in the city. In the ensuing chaos and anarchy his only sister's eldest son, Mirza Ashoor Baig with his son adolescent grandson became targets of an English man's bullets. Most of his friends and relatives were killed, some were hanged and others followed in the mass exodus. None were left to share his grief and sorrow.

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check your progress)
1۔ What do you know about Ghalib?
2۔ What is the contribution of Ghalib to Urdu literature?
3۔ Narrate in your own words the situation of Delhi at the time of Ghalib.

8.5 متن(۴)

Many years ago, I was working as a Chief System Analyst. The job involved a lot of travelling for project work, sometimes to a small village, sometimes to a neighboring city. Often, work compelled me to travel on holidays too.

One particular Friday, I was looking forward to a long weekend. The coming Monday was a holiday for some festival and taking advantage of the long weekend, we sisters had decided to meet at our grandmother's house in our native Shiggaon.

I was waiting for Friday to end. Sunday was a full-moon night and so a special moonlight dinner had been arranged for us. Moonlight dinners are favorite family occasions for the people of north Karnataka. We were all in a

hurry to wind up for the day when I heard someone calling out, "Kulkarni! Can you come to my office"?

My heart sank. It was my boss (calling me by my maiden name), and judging by his tone, the matter was urgent. Even though I was on my way out of the office, I stopped to enquire what he wanted.

"Sorry for disturbing you, but your service is required urgently," he said, handing over a letter for me to read. It said that I had to visit a project site within the next two days.

"No problem at all, sir, I shall attend to it," I said. I was used to working throughout the day and throughout the week, so cancelling my travel plans didn't bother met at all. My work gave me more happiness than any celebration or outing.

The next morning, I left for the town where the project was based. By the time I reached the town it was already noon, but it looked as though the day had just begun there. It was a small town. The shops were just opening and folks were setting our work.

I was walking from the bus stand, a young lad hurried towards me and said, "Sorry, I am late, ma'am. I was supposed to receive you at the bus stop." He was our client's representative and had come to take me to their office.

We reached the office after a few minutes' walk. It was a small office. Though by no means modern, it was neatly furnished with some old but reconditioned furniture, everything in its right place. They were all waiting for me and I felt nice as I sat down. The cool buttermilk they offered me was most refreshing.

Before beginning my work, I was introduced to a neatly dressed young man who was supposed to coordinate with me. He was quite well-mannered

and seemed very confident and bright. I was pleasantly surprised to see the good quality of his work. It had a professional touch. I was told that he was the most well-read man in that town.

He had documented his work very well and efficiently. Because of this, our job was completed sooner than expected. I did not forget to compliment him when I was about to leave. He went pink at my appreciation and insisted that I join him for tea at his residence close by.

His house was also well kept. By tea-time, his conversation had taken on a personal note. He talked about his parents, his early job. He introduced his wife and two-year-old son. He spoke with admiration about his wife's cooking, her beautiful voice, her achievements during her school days. Then he called for his son who immediately came in and stood by my side with folded arms, almost as if he was trained to do so. The moment the father asked him to recite a rhyme; he started to do so in his clear, childish voice.

I acknowledged his recitation by nodding my head. The father did not seem satisfied with such nominal recognition of his son's talents. He asked the child to identify all the letters of the alphabet from an old chart hanging on the wall. These are things that children usually hate to do, yet parents go on forcing them. Poor kids!

The display in my host's house went on for nearly half an hour until the child began displaying signs of restlessness and irritability. The mother, wisely, took the child away to the kitchen, hopefully to reward him with a chocolate or a biscuit.

I realized that the father was expecting to hear some compliment from me about his son. "Your child is very bright for his age," I said.

"Naturally! I have trained him like that from childhood, "he said with

pride. It sounded like he had been training his two-year-old child from the day of his birth!

"So you feel that it is only by training that a child can become bright like this?" I asked.

"No, no. Heredity and genes also play an important role. My son has taken after me." The man's face shone with pride and I was curious to hear more. After all, I had an hour to spare before my bus departed.

"You must have been a good student in your college days?" I probed.

"Yes, I was. I have always been a first ranker in my school and college days," he replied, clearly appreciative of himself.

"Where did you graduate from?" I was eager to hear more.

"I graduated from BVB Engineering College, Hubli".

I became alert. I knew Hubli. I knew the college. "Which year?" I asked.

"In 1972, with the first rank".

"Did you secure the gold medal also?" I persisted.

"Yes, I did obtain the gold medal for that year," he said glowing with self-satisfaction.

"By this time I was able to size him up quite clearly. And what I saw saddened me.

"May I see your gold medal?" I requested.

Suddenly, the mood in the room changed. "Why? Don't you believe me?" His voice was uncertain.

"No, I just want to see the gold medal you secured in 1972," I repeated.

"It is very precious to me and so I have kept it in a bank locker," he said.

I did not give up. "Which bank"?

"Why should I give you such details?" He demanded, annoyed with my persistence.

Everything was clear by now. I think it was clear to him too. The warmth of hospitality was over. It was time for my bus and time for me to go.

While walking towards the door, I told him, "I don't have to know any of the details about your bank or gold medal. It is none of my business. But I am sure that the medal cannot be with you".

"How can you say that? And that too so confidently?" He was quite angry by now.

"Because," I told him sadly, "I secured that gold medal in 1972 and only one gold medal is awarded each year".

He was stunned by this revelation and stared blankly at me. I looked at him and asked gently, "You are bright. You are good in your job. Why do you have to lie? What do you gain"?

The click of the front door shutting behind me was the only reply I received.

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check your progress)
1۔ How is the life of a System Analyst as depicted in the given text?
2۔ Narrate the conversation of author and the young man in your own words.

8.6 متن(۵) Childhood and Early Life

Describing Maulana Azad's childhood, his elder sister, Fatima Begum, says: “The late Maulana Azad, may God bless him, was four years younger to me. Both of us were born in Mecca. When Azad was two years old, father

brought us over to Calcutta where a large number of his devotees resided. My brother, whose real name was Mohiuddin Ahmed, Azad being his nom-de-plume, was educated at home, under father's supervision. Azad was a fair poet. Two verses that he composed at the age of 14 are still fresh in my memory.

‘My tender heart sheds tears of compassion,
Even when an enemy tells his tales of woe.
Look how my restless self-soars high and low,
Ask it something of the earth
And it replies in terms of the skies.’

“As a child Azad was never fond of the games children usually indulge in. Even at the age of eight, his games were unique. Sometimes, he would line up trunks and boxes and pronounce them to be a train. Then he would tie one of father's turbans round his head and taking his seat on one of the boxes, he would ask us, his sisters, to shout and cry 'Give way, give way, the Maulana from Delhi is on his way'. When we said, 'Brother, there is no crowd here, whom should we push aside or ask to get out of the way', he would remonstrate, 'Can't you follow this simple make-believe? Can't you visualise that a large crowd had come to receive me'. Then he would get down from the box and walk off slowly and deliberately, like an elderly person. Sometimes, he would climb a raised plat- form and ask his sisters to surround him and applaud him, imagining that he was speaking amidst thousands of persons who were cheering and applauding his speech. I, however, would say, 'Brother, there is nobody here except three or four of us. How can we imagine we are thou- sands'? Again he would say, 'It's all a game. That's how it happens in a game'.

“Once, plague broke out in Calcutta and father dispatched us, children to Hooghly. Azad was about 10 at that time. There was a big garden attached to the house where we were putting up. One day, Azad brought in a basketful of custard apples. There were so many of them that I immediately assumed he had brought the fruit from the attached garden and without the knowledge of the owner. 'Brother', I said, 'why have you taken these without permission? What would the owner think or say'? At this Azad's face turned crimson. He rushed with the basket to the well in the house and started throwing the fruit down the well, muttering, all the while, 'Am I a thief! Am la thief'! After he had emptied the basket, he declared, 'How dare you think that I had picked these fruits without permission? They were all duly paid for'?

“On another occasion, our elder sister, who had a temper of her own, told father in our presence: 'Father, all your children are good for nothing? They are like rotten eggs'. At this Azad immediately began to chirp like a newly hatched chick and said, 'No, no, Sir, you know by our chirping that we are healthy chicks, not rotten eggs’.

“Azad had a passion for studying. When he was about 17, a thief broke into our house and finding Azad lost in his studies, he picked up a cigarette case from the table at which Azad was reading and also removed about Rs 7,000 from a trunk in the room without Azad being any the wiser. The next day, when the loss of the money and the cigarette case was discovered, we started reviling the thief. But Azad said, 'Please don't abuse him. The poor man must be in great trouble and in sore need of money to commit crime. We should rather pity him”.

“Indeed it may be said that Azad had never a real childhood. Even while he was seven years old, it seemed to us that his tiny shoulders bore

quite an adult mind." The above narrative indicates how apparent it was even in those early days that Azad had a bright future and that the prodigious child was bound to develop into a towering personality.

One of Azad's ancestors, Maulana Jamaluddin alias Sheikh Bahlol of Delhi, was a contemporary of Akbar the Great. He was one of the few scholars who had refused to sign the statement acclaiming the king as the founder of a new religious order although Mulla Mubarak and other leading priests and scholars of the time had readily done so. Jamaluddin's son, Sheikh Mohammad, was a disciple of Hazrat Mujaddid Alf Sani, the Sheikh Ahmad of Sirhind. Sheikh Mohammad emulated his father by refusing to pay obeisance to Emperor Jahangir and was imprisoned in the Gwalior Fort for his insubordination. Azad's famous book Tazkira chronicles the life of Sheikh Jamaluddin about whom Mulla Abdul Qadir Badauni wrote, in his Muntakhabut Twarikh, that 'he would have nothing to do with worldly people'. Azad was quite proud of this compliment and wrote:

“This evidence was a source of great delight to me. The idea that (by the grace of God) our family had always distinguished itself with the pursuit of learning and the zeal to serve the cause of Hadith and Sunnah, that from the very beginning our claim to distinction consisted in that we preferred poverty, loved to sit on bare ground and shunned success, which made people speak reverently of us as 'steadfast in the observance of the Sunnah beyond the pale of worldly temptations' gladdened my heart and made my mind drunk with happiness.”

This clearly shows that it was ever in Azad's family tradition to revolt against untruth and injustice and to hold aloft the flag of righteousness.

Some people are doubtful about Delhi being Maulana Azad's home-

town. One of them has tried hard to prove that he belonged to Kasur in undivided Punjab. The only link Azad had with Kasur was that his paternal grand-mother's father belonged to this place.

Azad's family tree is as follows:

Maulana Abu'l Kalam Azad, son of Maulana Khairuddin, son of Maulana Mohammad Hadi, son of Shah Mohammad Afzal, son of Maulana Mohammad Hasan. All of these ancestors hailed from Delhi, and Azad was perfectly justified in claiming that he belonged to Delhi.

Maulana Munnawaruddin, father of Azad's grand-mother got frustrated at the conditions prevailing in the country during 1855. He decided to migrate to Hedjaz. On his way to Bombay for boarding the ship he passed through Bhopal. Nawab Sikander Begum, the ruler of Bhopal, was so impressed by his sermons that she prevailed upon him to stay on there. When the revolt of 1857 started, Maulana Munnawaruddin again decided to leave and, after peace had been restored, he journeyed to Bombay. There too some of his followers did not allow him to leave immediately. He was further detained by ill health and ultimately passed away in Bombay some time during 1858-59.

Azad's father, Maulana Khairuddin, who had accompanied Maulana Munnawaruddin to Bombay, however continued his journey to Hedjaz. He had already finished his education in India and hence was able to derive the full benefit from the teachings of the scholars at Mecca and Medina. In 1870-71, he married Alia, daughter of the sister of one of his teachers, Sheikh Mohammad Zahir Vatri. Maulana Khairuddin had five children, two sons and three daughters, by her. The sons were Abu'l Nasr Ghulam Yaseen and Abu'l Kalam Mohiuddin Ahmed and the daughters were Zainab, Fatima and Hanifa alias Mahmuda. Both the brothers used to compose verses; Abu'l Kalam's

poetic name was 'Azad' while that of Abu'l Nasr was 'Aah'. Apart from the eldest sister, Zainab (born in Constantinople), the other two sisters were also poetesses, the poetic name of the youngest sister being 'Abroo' and that of the other sister 'Arzoo'. Abroo Begum was deeply attached to Azad. Her husband was employed in Bhopal on a decent salary and they had settled down in that city. Abroo Begum died in June 1942 while Arzoo Begum expired on 12 April 1959 at the age of 82.

اپنی پیش رفت کی جانچ کریں(Check Your Progress)

1۔ Who was Fatima Begum?

2۔ What were the two verses in Urdu that were composed by Moulana Azad at the age of fourteen? Explain the meaning of those verses.

3۔ "Indeed, it may be said that Azad had never a real childhood". Why did Azad's sister make this statement?

8.7 خلاصہ(Summary)

اس اکائی میں پانچ انگریزی متون شامل ہیں جن کا مقصد طلبہ میں مطالعہ، تفہیم، اور اظہار کی صلاحیت کو فروغ دینا ہے۔ پہلا متن "Let's Fight Terror Together" وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے اس پیغام پر مبنی ہے کہ جنوبی ایشیائی ممالک کو دہشت گردی کے خلاف مشترکہ کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ امن و استحکام ہی ترقی کی بنیاد ہے۔ دوسرا متن "Philosophy, Education and Their Inter-Dependence" فلسفہ اور تعلیم کے باہمی تعلق کو واضح کرتا ہے کہ فلسفہ نظریہ فراہم کرتا ہے جبکہ تعلیم اس کا عملی نفاذ ہے۔ تیسرا متن مرزا غالب کی سوانح عمری پر مبنی ہے، جس میں ان کی زندگی، شاعری اور دور کے سیاسی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھا متن ایک خاتون تجزیہ کار کے تجربے پر مبنی ہے جو دیانت داری اور خود پسندی کے درمیان فرق کو اجاگر کرتا ہے۔ پانچواں متن مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن، ان کی ذہانت، اخلاقی قدروں اور ابتدائی زندگی کے واقعات کو بیان کرتا ہے جو ان کی عظیم شخصیت کی بنیاد بنتے ہیں۔ یہ تمام متون مطالعہ کرنے والے کو فکری وسعت، زبان کی مہارت، اور سماجی و اخلاقی شعور فراہم کرتے ہیں۔

8.8 اکتسابی نتائج(Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ درج ذیل صلاحیتیں حاصل کر سکیں گے:

- انگریزی زبان کے مختلف اسالیب اور اظہار کے طریقوں کو سمجھ سکیں گے۔
- تحریر اور تقریر دونوں میں تنقیدی و تخلیقی اظہار کی مہارت پیدا کریں گے۔
- فلسفہ اور تعلیم کے تعلق کو وضاحت سے بیان کر سکیں گے۔
- مرزا غالب اور مولانا آزاد کی علمی و ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔
- کردار سازی، دیانت داری، اور حقیقت پسندی کی اخلاقی قدروں کو سمجھ سکیں گے۔
- مختلف متون کی تفہیم کے ذریعے اپنی زبان دانی میں بہتری لا سکیں گے۔

8.9 فرہنگ (Glossary)

- **دہشت گردی (Terrorism):** سیاسی یا مذہبی مقاصد کے لیے خوف و ہراس پھیلانے کا عمل۔
- **امن (Peace):** سکون، ہم آہنگی اور جھگڑوں سے آزادی کی حالت۔
- **سفارت کاری (Diplomacy):** ممالک کے درمیان تعلقات کو بہتر طور پر سنبھالنے کا فن۔
- **اخلاقیات (Ethics):** صحیح اور غلط کے اصولوں اور انسانی کردار کا مطالعہ۔
- **عقلیت (Rationality):** سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی معقول صلاحیت۔
- **ذمہ داری (Responsibility):** کسی کام یا فرض کو ایمانداری سے انجام دینے کا رویہ۔
- **انسانیت (Humanity):** ہمدردی، رحم دلی اور دوسروں کی فلاح کا جذبہ۔
- **حب الوطنی (Patriotism):** اپنے وطن سے محبت اور اس کے لیے قربانی کا جذبہ۔
- **دانائی (Wisdom):** علم، تجربے اور فہم سے درست فیصلے کرنے کی صلاحیت۔

8.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Type Questions)

1۔ "Let's Fight Terror Together" تقریر کس نے کی؟

a) ڈاکٹر منموہن سنگھ b) اندرا گاندھی c) اٹل بہاری واجپئی d) نریندر مودی

2۔ فلسفہ کا لفظی مطلب کیا ہے؟

a) علم کی محبت b) علم کا انکار c) حقیقت کی جستجو d) تعلیم کا عمل

3۔ مرزا غالب کہاں پیدا ہوئے تھے؟

a) دہلی b) آگرہ c) کلکتہ d) لکھنؤ

4۔ متن "Chief System Analyst" میں مصنفہ کو کس بات پر افسوس ہوا؟

a) چھٹی نہ ملنے پر　　b) ایک شخص کے جھوٹ بولنے پر

c) کام کی زیادتی پر　　d) سفر کی تھکان پر

5۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام کیا تھا؟

a) مولانا احمد آزاد　　b) محی الدین　　c) ابوالکلام محی الدین　　d) احمد الہندی

مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے دہشت گردی کے بارے میں کیا کہا؟

2۔ فلسفہ اور تعلیم کے درمیان تعلق کس طرح کا ہے؟

3۔ مرزا غالب کی زندگی کے دو اہم پہلو بیان کریں۔

4۔ Chief System Analyst کے واقعے سے کیا اخلاقی سبق ملتا ہے؟

5۔ مولانا آزاد کے بچپن کے کھیلوں سے ان کی شخصیت کے کون سے پہلو ظاہر ہوتے ہیں؟

طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1۔ "Let's Fight Terror Together" میں وزیر اعظم کا پیغام جنوبی ایشیا کے امن و ترقی کے لیے کس قدر اہم ہے؟ وضاحت کریں۔

2۔ فلسفہ اور تعلیم کی باہمی انحصاریت (Interdependence) پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

3۔ مرزا غالب کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیں۔

4۔ Chief System Analyst کی کہانی میں انسانی اخلاق اور دیانت داری کا کیا پیغام دیا گیا ہے؟

5۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی زندگی کے واقعات ان کے مستقبل کے کردار کی کس طرح جھلک دکھاتے ہیں؟

8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Materials)

1۔ A statement of Prime Minister Dr. Manmohan Singh given on the occasion of SAARC summit published in The Hindu on 18-11-2005.

2۔ A part from the B.Ed. book entitled Education and Society published by IGNOU.

3۔ A part from brief biography entitled "Great poet Mirza Ghalib" published

on the occasion of 200th Birth Anniversary.

4. A story from the book "Wise and other Wise" written by Suda Murty.

5. Childhood & Early Life - A chapter from the book “Moulana Azad” by Aish Malsayami.